حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی سوانحعمری اور اُنکے کلام پر

محققانہ ریویو

از شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی مرحوم

جسکو کارپردازان الناظر بک ایجنسی لکھنؤ نے برائے نفع

برخوردار اسمٰعیل سلمہٗ

الناظر پریس واقع لکھنؤ میں طبع کیا

مولانا شبلی کی مشہور تصانیف

سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

جسکی ترتیب، تیاری و طباعت کے لیے علیاحضرۃ بیگم صاحبہ بھوپال نے بیش قرار مستقل وظیفہ عطا فرمایا، جلد اول بکمال آب و تاب چھپکر شایع ہوگئی ہے۔ قیمت باختلاف کاغذ و نقشہ جات لعہ ۵ و ۳

مجموعۂ کلام شبلی

یعنی مولانا شبلی کا اُردو کلام۔ اس مجموعہ میں ایک مثنوی، کثیر التعداد نظمیں، متعدد غزلیات، قطعات وغیرہ غرضکہ جملہ اصناف کا کلام ہے قیمت ۱۲ار

مثنوی صبح امید

مولانا شبلی کی سب سے پہلی اُردو نظم قیمت ۴ر

شعر العجم

فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا عہد بعہد کی ترقیوں اور اُنکے خصوصیات اور اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے اور اسی کے ساتھ تمام مشہور شعرا کا مفصل تذکرہ اور انکی شاعری پر تقریظ اور تنقید ہے قیمت جلد اول ے ر جلد دوم ۱ر جلد سوم ۱ر جلد چہارم ۱ر۔

الفاروق - حضرت عمرؓ کی سوانحعمری ۲ر

الغزالی - امام غزالیؒ کے سوانحی حالات ۲ر

سیرۃ النعمان - حضرت امام ابو حنیفہ کی سوانحعمری ۱ر

المامون - مامون الرشید کی سوانحعمری ۱ر

سوانحعمری مولانا روم ۱ر **بیان خسرو** ۸ر

علم الکلام - حصہ اول ۱ر حصہ دوم ۲ر

رسائل شبلی - ۱۱ مضامین کا مجموعہ ۱ر

مقالات شبلی - ۱۲ مضامین کا مجموعہ ۱ر

آغاز اسلام - حضور سرور کائنات کے مختصر حالات ۱۲ار

مضامین عالمگیر - اورنگ زیب کے معترضین کے جوابات ۱۰ر

کتبخانہ اسکندریہ - اس مشہور کتبخانہ کی بربادی کے ذمہ دار مسلمان کہے جاتے تھے اس الزام کی تردید۔ ۶ر

زیب النسا بیگم ار **جہانگیر** ۲ر

اسلامی حکومت اور ہندوستان کے تمدن پر اسکا اثر ۲ر

موازنہ انیس و دبیر - - - للعہ ر

الانتقاد - علامہ جرجی زیدان مصری کے مضمون تنقید عربی زبان میں - - - ۸ر

دیوان شبلی - فارسی ۸ر **دستہ گل** - فارسی ۴ر

بوئے گل فارسی ۴ر **برگ گل** فارسی ۴ر

ملنے کا پتہ: - الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیانِ خسرو

ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین کے لقب سے مشہور ہے۔ حضرت امیر خسرو[1] اسی قبیلے سے ہیں۔ انکے والد کا نام سیف الدین محمود ہے۔ ترکستان میں ایک شہر کش ہے وہاں کے رہنے والے اور اپنے قبیلے کے رئیس تھے۔ فرشتہ اور دولت شاہ نے لکھا ہے کہ یہ اُنکے امراء میں سے تھے چنگیز خاں کا فتنہ جب اٹھا تو سیف الدین ہجرت کرکے ہندوستان میں آئے اور سلطان محمد تغلق کے [illegible] ایک

---

[1] حضرت امیر خسرو کا حال تمام تذکروں میں کسی قدر تفصیل سے پایا جاتا ہے۔ تاریخ فرشتہ میں بھی [illegible] حالات ہیں لیکن خود امیر صاحب نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں جو مختصر حالات لکھے ہیں وہ سب [illegible] امیر صاحب کی [illegible]
[illegible] پانچ [illegible] انکے [illegible] پانچ [illegible]
[illegible] حضرت امیر خسرو کی
تصنیفات سے [illegible] کتب [illegible] سے بھی مدد لی ہے۔

بڑے عہدہ پر مامور ہوئے۔ محمد تغلق ان کی نہایت قدر و منزلت کرتا تھا، ایک مہم میں کفار سے لڑ کر شہید ہوئے۔

لیکن صاحب بہارستان سخن، تاریخی استدلال سے اس واقعہ کا ناممکن ہونا ثابت کر کے لکھتے ہیں،

"پس آنچہ دولت شاہ در تذکرۂ خود نوشتہ کہ پدر امیر خسروؒ در عہد سلطان محمد تغلق شہید شدہ و امیر خسرو را در حق وے قصائد عزا است خلاف صریح و محض غلط است غالباً شاہزادۂ سلطان محمد شہید را کہ حاکم ملتان بود و بعلت اشتراک اسمی محمد تغلق خیال کردہ"

بہرحال سیف الدین کے تین بیٹے تھے، اعز الدین علی شاہ، حسام الدین، اور امیر خسرو، سیف الدین کے انتقال کے وقت امیر صاحب کی عمر[1] ۷ برس کی تھی، امیر صاحب کی والدہ عماد الملک کی بیٹی تھیں جو مشہور امرائے شاہی میں سے تھے، اور دس ہزار فوج کے افسر تھے۔ امیر صاحب ۶۵۱ھ میں بمقام پٹیالی[2] پیدا ہوئے، قدیم خوش اعتقادی نے یہ روایت پیدا کی کہ جب وہ پیدا ہوئے

[1] والہ داغستانی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ امیر خسرو، باپ کے ساتھ غزنین کے اطراف سے ہندوستان میں آئے، اور پھر لکھتے ہیں کہ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو کی ماں حاملہ آئی تھیں، خسرو دہلی میں پیدا ہوئے لیکن پہلی روایت بظاہر صحیح ہے" تمام واقعات تاریخی سے ثابت ہے کہ خسرو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے لیکن والہ داغستانی کو کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی خاک سے ایسا شخص پیدا ہو۔

[2] پٹیالی ضلع ایٹہ کمشنری آگرہ میں چھوٹا سا قصبہ ہے پہلے یہی مقام ضلع کا صدر تھا، اب ایٹہ ہے، کسی زمانہ میں دریائے گنگ اسکے نیچے بہتا تھا، لیکن اب میلوں کا فاصلہ ہے۔ یہاں اب اسٹیشن بھی ہے ۱۲

تو امیر سیف الدین ایک خرقہ میں لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس لیگئے، مجذوب
نے دور ہی سے دیکھکر کہا کہ وہ شخص آتا ہے جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے
جائیگا، مجذوب صاحب کے کمالات کا ہم انکار نہیں کرتے، لیکن انکے شاعرانہ ذوق
کا تسلیم کرنا مشکل ہے، خاقانی کو امیر خسرو سے کیا نسبت۔

جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو انکے والد نے انکو مکتب میں بٹھایا اور
خوشنویسی کی مشق کے لیے مولانا سعد الدین خطاط کو مقرر کیا لیکن امیر صاحب
کو پڑھنے لکھنے کے بجائے شعر گوئی کی دھن رہتی تھی، جو کچھ موزون ناموزون کہ
سکتے تھے کہتے تھے اور وصلیوں پر اسی کی مشق کرتے تھے۔ خواجہ اصیل کوتوال
کے نائب تھے، وہ کبھی کبھی سعد الدین خطاط کو خطوط وغیرہ لکھوانے کو بلا لیا کرتے
تھے، ایک دن بلایا تو امیر صاحب بھی ساتھ گئے۔ خواجہ اصیل کے مکان پر
خواجہ عزیز الدین بھی تشریف رکھتے تھے، سعد الدین نے خواجہ صاحب سے
کہا کہ یہ لڑکا ابھی سے کچھ خوش خیال کرتا ہے، معلوم نہیں کہ موزون بھی کہتا ہے یا
نہیں، آپ ذرا اسکے کلام کو سن لیجیے، خواجہ عزیز کے ہاتھ میں اشعار کی بیاض
تھی، امیر صاحب کو دی کہ کوئی شعر پڑھو، امیر صاحب نے نہایت خوش الحانی
سے پڑھا، چونکہ آواز میں قدرتی تاثیر تھی، لوگوں پر اثر ہوا، سب کی آنکھیں
بھر آئیں، اور سب نے بے اختیار تحسین کی، انکے استاد نے کہا شعر گوئی میں
امتحان لیجیے، خواجہ عزیز الدین نے چار بے جوڑ چیزوں کا نام لیا کہ انکو ملا کر شعر کہو
مو، بیضہ، تیر، خربزہ، امیر صاحب نے برجستہ کہا،

ہر موے کہ در دو زلف[لہ] آں صنم است   صد بیضۂ عنبریں برآں موے ضم است

لہ جس نسخہ سے یہ رباعی نقل کی ہے وہ غلط تھا میں نے اسی طرح نقل کر دیا۔

چوں تیرہ داں راس دلش را از یرا کہ | چوں خربوزہ دندانش درون تکلم است

خواجہ عزیز الدین کو سخت حیرت ہوئی، پوچھا نام کیا ہے؟ اُنھوں نے کہا خسرو، باپ کا نام پوچھا انھوں نے اصل نام کے بجائے قبیلہ کا نام بتایا، یعنی لاچین، خواجہ صاحب نے ظرافت سے کہا لاچین یعنی "چین نہیں" پھر کہا "ترک خطا ست" یعنی انکو ترک کہنا خطا ہے؟ انھوں نے اسی لفظ کو اُلٹکر کہا "بے خطا ترک است" یعنی قطعاً وہ ترک ہے، خواجہ صاحب نے کہا چونکہ تمکو دربار سلطانی سے تعلق ہے اسلیئے تمکو سلطانی تخلص کرنا چاہیئے، چنانچہ تحفۃ الصغر[۱] کی اکثر غزلونمیں یہی تخلص ہے،

امیر صاحب کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی کی تحصیل تمام تھی لیکن تذکرہ نویسوں نے اسکے متعلق کچھ تفصیل نہیں لکھی، تاہم یہ قطعی ہے کہ ۲۰، ۱۵ برس کی عمر میں یہ تمام درسی علوم و فنون سے فارغ ہو چکے تھے،

درباری تعلقات امیر خسرو صاحب سن رشد کو پہونچے تو دلی کے تخت پر سلطان غیاث الدین بلبن صدر نشین تھا، جو ۶۶۴ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا تھا، اسکے امرائے دربار میں سے کشلو خاں معروف بہ چھجو[۲] بہت بڑے رتبہ کا سردار تھا وہ سلطان

---

[۱] یہ تمام حالات اپنے امیر صاحب نے خود تحفۃ الصغر میں لکھے ہیں،

[۲] چھجو خاں کا نام تاریخوں میں اس طرح مختلف لقب اور خطاب سے آتا ہے کہ دھوکا ہوتا ہے کہ ایک شخص ہے یا کئی ہیں، امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میں نانا کی وفات کے بعد سب سے پہلے خان معظم کشلو خاں عرف چھجو کے دربار میں پہونچا، اس سے اسقدر ثابت ہوا کہ کشلو اور چھجو ایک ہی شخص ہیں، بدایونی (صفحہ ۱۵۸ جلد اوّل) میں ہے کہ چھجو آخر میں کڑہ مانک پور کے ساتھ سامانہ کا حاکم مقرر ہوا تھا، اور سلطان معز الدین کیقباد نے اس کی بیٹی سے شادی کی تھی، فرشتہ میں لکھا ہے کہ علاء الدین محمد

کا بھتیجا اور باربکی کے عہدے پر مامور تھا۔ **فرشتہ** میں لکھا ہے کہ مجلس آرائی اور جود و کرم کی وجہ سے حاتم کی طرح مشہور ہو گیا تھا۔ اور مصر، شام، روم، بغداد، عراق، خراسان، ترکستان وغیرہ سے اہل کمال اور شعرا اُسکے دربار میں آتے تھے اور کامیاب ہوکر جاتے تھے۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ جو کچھ نقد اسباب سامان تھا سب لٹا دیا یہانتک کہ خود اسکے بدن پر پیرہن کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

امیر صاحب کو جیسا کہ خود غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھا ہے، سب سے پہلے اسکے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور دو برس تک اسکے دربار میں ملازم رہے، چنانچہ اکثر قصیدے اسکی مدح میں لکھے ہیں، ایک قصیدہ میں مدح کی تمہید لکھتے ہیں،

بود پنہاں آفتاب آں دم کہ صبح — ہمدمی با باد عنبر بو نمود
صبح را گفتم کہ خورشیدت کجاست — آسماں روئے ملک چھجو نمود

امیر صاحب نے مثنوی نہ سپہر میں لکھا ہے،

زشاہاں کسے کاو علم کرد یاد — معز الدنا بود شہ کیقباد

لیکن اس سے کشلو خاں کی اولیت پر حرف نہیں آتا، کشلو خاں امراء میں سے تھا، بادشاہ نہ تھا۔ بادشاہوں میں سے البتہ سب سے پہلے جس نے امیر صاحب کی قدردانی کی وہ معز الدین کیقباد تھا، امیر صاحب اکثر کشلو خاں کے دربار میں

(بقیہ نوٹ ۲) بن اعز الدین، سلطان غیاث الدین بلبن کا برادر زادہ تھا، سلطان نے اسکو ایک تقریر کرکے خان اعظم کو کشلی خاں کا خطاب دیا، بدایونی (صفحہ ۱۶۴) میں ملک چھجو کو برادر زادہ سلطان غیاث الدین لکھکر لکھا ہے کہ اسکو کشلو خاں خطاب ملا تھا، ان تمام عبارتوں کو ملاؤ تو ثابت ہوگا کہ علاء الدین، کشلو خاں، چھجو ایک ہی شخص ہیں۔

تصنیف کرکے سناتے اور مجلس گرم کرتے تھے۔

ایک دن اتفاق سے بغرا خاں (سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا) موجود تھا اور شعر وشاعری کے چرچے ہو رہے تھے، شمس الدین دبیر، اور قاضی اثیر جو مشہور شعرا میں سے تھے وہ بھی حاضر تھے، امیر صاحب نے اپنی زمزمہ سنجی سے وہ سماں باندھا کہ بغرا خاں نہایت متاثر ہوا، اور صلہ کے طور پر لگن بھر کر روپے دیے۔ کتلو خاں کو یہ ناگوار ہوا کہ اُسکا وابستۂ دولت دوسرے دربار کا احسان اُٹھائے چہرہ سے ملال کے آثار ظاہر ہوئے، امیر صاحب نے اسکے بعد بار بار مختلف موقعوں پر اسکی تلافی کرنی چاہی لیکن کتلو خاں کے دل سے وہ پھانس نہ نکلی۔

بغرا خاں سامانہ کا حاکم تھا، امیر صاحب نے ملک چھجو سے مایوس ہوکر سامانہ کا قصد کیا، بغرا خاں نے نہایت قدر وعزت کی اور ندیم[۱] خاص بنایا، اسی زمانہ میں ۶۷۹ھ میں لکھنوتی (بنگال) میں طغرل نے بغاوت کی اور شاہی لشکر کو بار بار شکستیں دیں، بالآخر سلطان غیاث الدین بلبن نے خود اس مہم پر جانے کی طیاریاں کیں اور بغرا خاں کو ساتھ[۲] لیا۔ امیر صاحب بھی اس سفر میں ساتھ[۳] گئے۔ سلطان غیاث الدین اس بغاوت کو فرو کر کے دلی واپس آیا اور

---

[۱] یہ تمام حالات خود امیر صاحب نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھے ہیں۔

[۲] تاریخ فرشتہ

[۳] امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں ان واقعات کو خود لکھا ہے، لیکن اسقدر پیچیدہ لکھا ہے کہ بڑی مشکل سے اور تاریخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے اصل حال کا پتہ چلتا ہے، ایک اور دقت سخت تر یہ ہے کہ غرۃ الکمال کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے، وہ سخت غلط اور گویا بالکل مسخ ہے۔ ۱۲

بنگالہ کی حکومت بغرا خاں کو عنایت کی، امیر صاحب کو اب زیادہ امن و اطمینان کا موقع حاصل تھا، دربار کے شعرا شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی انکے قیام پر مصر تھے، لیکن وہ دلّی کو بنگال کے معاوضہ میں نہیں دے سکتے تھے، چنانچہ رخصت لیکر دلّی میں آئے، اتفاق سے اسی زمانہ میں سلطان غیاث الدین کا بڑا بیٹا ملک محمد قاآن (مشہور بہ خان شہید) دلّی میں آیا تھا، وہ نہایت قابل صاحب علم، فیاض اور قدردان علم و فن تھا، تہذیب و متانت کا یہ حال تھا کہ جب دربار میں بیٹھتا تو گو کبھی کبھی دن کا دن گزر جاتا تھا، لیکن زانو نہیں بدلتا تھا، اسکی مجلس میں ہمیشہ شاہنامہ، دیوان خاقانی، انوری، خمسہ نظامی کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ ایک بیاض تیار کی تھی، جس میں اپنے مذاق کے موافق بیس ہزار شعر انتخاب کرکے درج کیے تھے، تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ان اشعار کے حسن انتخاب پر امیر صاحب اور خواجہ حسن دہلوی بھی داد دیتے تھے، یہ بیاض ایسی نادر چیز تھی کہ جب شاہزادہ کا انتقال ہوا تو سلطان غیاث الدین نے اپنے خاص دوات دار امیر علی کو دی، امیر علی کے بعد امیر صاحب کے ہاتھ آئی، اور اہل ذوق اسکی نقلیں لیتے تھے اور بیاضوں میں درج کرتے تھے[1]۔

امیر صاحب کی شاعری کا شہرہ ہو چکا تھا، سلطان محمد نے انکو بلا کر شعرائے خاص میں داخل کیا، اور جب وہ ملتان کا حاکم مقرر ہو کر گیا تو ان کو اور انکے ساتھ خواجہ حسن دہلوی کو بھی ساتھ لے گیا، پانچ برس تک یہ اسکے دربار میں رہے، اس زمانہ میں ہلاکو خاں کا پوتا ارغو خاں ایران کا حکمران تھا، اسکے امرا میں سے تیمور خاں بیس ہزار سوار لیکر لاہور اور دیبالپور کو فتح اور غارت کرتا ہوا

[1] تاریخ فرشتہ

ملتان کی طرف بڑھا، سلطان محمد قاآن نے ملتان سے نکلکر تیمور خاں کو شکست دی، لیکن چونکہ ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی، ایک تالاب کے کنارے پانچ سو آدمیوں کے ساتھ نماز میں مشغول ہوا، موقع پاکر تاتاریوں نے دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ حملہ کیا، سلطان محمد نے انھی نمازیوں کے ساتھ نماز سے فارغ ہوکر تاتاریوں کا مقابلہ کیا، اور گو بار بار اُنکو شکستیں دیں، لیکن اتفاق سے ایک تیر آکر لگا، اور زخم کھا کر مرگیا[1]۔

امیر صاحب اور خواجہ حسن دہلوی بھی اس معرکہ میں شریک تھے، چنانچہ تاتاری انکو گرفتار کرکے بلخ لے گئے، یہ واقعہ ۶۸۳ھ میں پیش آیا[2]، امیر صاحب نے نہایت پُر اثر مرثیے لکھے اور دلی بھیجے، مہینوں تک لوگ گھر گھر ان مرثیوں کے اشعار پڑھتے تھے اور اپنے مقتول عزیزوں پر نوحہ کرتے تھے۔ چند اشعار ہم ذیل میں درج کرتے ہیں،

واقعہ است ایں یا بلا از آسماں آمد پدید — آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید

راہ در بنیادِ عالم داد سیل فتنہ زا — رخنۂ کامسال در ہندوستاں آمد پدید

مجلسِ یاراں پریشاں شد چو برگِ گل زباد — برگ ریزی گوئی اندر بوستاں آمد پدید

بسکہ آبِ چشم خلقے شد رواں در چار سُو — پنج آبے دیگر اندر مولتاں آمد پدید

جمع شد سیارہ در چشم گر طوفاں شود — چوں بہ برجِ آبی انجم را قراں آمد پدید

من نخواہم جز ہماں جمعیت ایں کے شود

خود محال ست ایں نبات النعش پروین کے شود

تا چہ ساعت بُد کہ شاہ از مولتاں لشکر کشید — تیغ کافر کُش برائے کشتن کافر کشید

---

[1] تاریخ فرشتہ ۱۲ [2] بدایونی صفحہ ۱۳۱ - ۱۲

انچہ حاضر بود لشکر، لشکرِ دیگر نہ جست | زانکہ رستم را نشاید نست لشکر کشید
چوں خبر کردندش از دشمن بداں قوت کہ داشت | بے محابا خشم در سر کردہ و رایت بر کشید
یک شش از مولتانش تا بہ لاہور اوفتاد | یعنی اندر عہد من کافر تواند سر کشید
آنچناں رنگیں کنم امسال خاک از خونِ شاں | کز زمیں باید شفق را گونۂ احمر کشید
او دریں تدبیر و آگہ نے کہ تدبیرِ فلک | صفحۂ تدبیر را خطِ مشیت در کشید

تا چہ ساعت بُد کہ کافر بر سر لشکر کشید
میگذشتند جوق جوق از آب دناگہ در کشید

بہت بڑا مرثیہ ہے اور لڑائی کی تمام کیفیت لکھی ہے، اخیر کے بند جہاں شاہزادہ کی شہادت کا ذکر ہے نہایت پر اثر ہیں،

دو برس کے بعد امیر صاحب نے کسی طرح تاتاریوں کے ہاتھ سے رہائی پائی اور دلّی میں آئے، خان شہید کے مرنے پر جو نوحہ لکھا تھا، غیاث الدین بلبن کے کے دربار میں جا کر پڑھا، دربار میں کہرام پڑ گیا، کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا، سلطان اس قدر رویا کہ بخار آ گیا اور بالآخر اسی صدمہ میں انتقال کر لیا۔

امیر دلّی سے پٹیالی میں آئے اور گنگا کے کنارے قیام پذیر ہوئے ۶۸۶ھ میں سلطان غیاث الدین بلبن نے وفات پائی اور درباریوں نے اس کے خلاف وصیت، اسکے پوتے کیقباد کو جو بغرا خاں کا بیٹا تھا تخت نشیں کیا،

کیقباد نے امیر صاحب کو دربار میں طلب کیا، لیکن چونکہ عنانِ سلطنت ملک نظام الدین کے ہاتھ میں تھی، اور وہ امیر صاحب سے صاف نہ تھا، امیر صاحب نے تعلق پسند نہ کیا اور خانِ جہاں جو امرائے شاہی میں تھا اسکی

ملازمت اختیار کی،

خان جہاں اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا اور امیر صاحب کو ساتھ لے گیا، چنانچہ خود قران السعدین میں فرماتے ہیں،

خان جہاں حاتم مفلس نواز — گشت باقطاعِ اودھ سرفراز

من کہ بدم چاکرِ او پیش ازاں — کرد کرم انچہ کہ بد بیش ازاں

تاز چناں بخشش خاطر فریب — بندہ شدہ لازمۂ آن رکیب

در اودم بردہ ز لطف چناں — کیست کہ از لطف تابد عناں

در اودھ از بخششِ او تا دو سال — ہیچ غم و نالہ نبود از منال

دو برس تک اودھ میں رہے، انکی والدہ کو ان سے حد سے زیادہ محبت تھی، وہ دلی میں تھیں، اور انکے خطوط آتے رہتے تھے کہ میں تم سے دور رہکر زندہ نہیں رہ سکتی، امیر صاحب کو بھی ماں سے بے انتہا محبت تھی، چنانچہ سب تعلقات چھوڑکر دلّی میں آئے، ماں نے گلے سے لگایا، اور آنکھوں سے محبت کے دریا بہائے،

مادرم آن خستۂ تیمارِ من — چوں نظر انگندہ بدیدارِ من

پردہ ز روے شفقت برگرفت — اشک فشاناں بہ برم درگرفت

کیقباد جب تخت سلطنت پر بیٹھا تو عیاشی اور رندی شروع کی، اسکا باپ بغرا خاں بنگال میں تھا، یہ حالت سنکر بنگال سے روانہ ہوا، کیقباد نے ناخلفی سے باپ کا مقابلہ کرنا چاہا، چنانچہ ایک عظیم الشان فوج تیار کرکے دلی سے روانہ ہوا، راہ میں نامہ و پیغام ہوتے رہے، آخر صلح پر خاتمہ ہوا اور کیقباد دلی کو واپس گیا،

امیر صاحب نے باپ بیٹے کے اتحاد اور مصالحت پر ایک قصیدہ لکھا، جسکے چند شعر یہ ہیں :

زہے ملک خوش چوں دو سلطاں یکے شد | زہے عہد خوش چوں دو پایاں یکے شد
پسر بادشاہے، پدر نیز سلطاں | کنوں ملک بیں چوں دو سلطاں یکے شد
ز مہر جہانداری و بادشاہی | جہاں را دو شاہِ جہاناں یکے شد
یکے ناصرِ عہد محمود سلطاں | کہ فرمانش در چار ارکاں یکے شد
دگر شہ معز جہاں کیقباد سے | کہ در ضبطش ایران و توراں یکے

کیقباد چاہتا تھا کہ یہ واقعات، نظم کے پیرایہ میں آئیں، امیر صاحب کو بلاکر یہ خواہش ظاہر کی، چنانچہ امیر صاحب نے چھ مہینے کی مدت میں قران السعدین لکھی، جس میں باپ بیٹے کی مراسلات اور ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے، اُسوقت امیر صاحب کی عمر ۳۶ برس کی تھی اور سنہ ہجری ۶۸۱ تھا چنانچہ خود فرماتے ہیں،

ساختہ گشت از دمِ خامہ | از پسِ شش ماہ چنیں نامہ
در رمضاں شد بسعادت تمام | یافت قراں نامہ سعدین نام
آنچہ بتاریخ ز ہجرت گذشت | بود سنِ شش صد و ہشتاد و ہشت
سالِ من امروز اگر بررسی | راست گویم ہمہ شش بود و سی

کیقباد عیاشی میں بیمار ہوکر تین برس حکومت کے بعد سنہ ۶۸۹ھ میں مرگیا یا مارا گیا، اسکے بعد اسکا خرد سال بیٹا شمس الدین کیکاؤس تخت نشین ہوا، وہ بالکل بچہ تھا، تین مہینے کے بعد امرائے دربار نے تخت سے اُتار کر قید کردیا، اب

خاندان میں کوئی شخص دعویدار سلطنت نہیں رہا تھا اسلیے تُرکی امرائے دربار میں سے ملک فیروز شایستہ خاں خلجی جس کی عمر ۷۰ برس کی تھی، اور جس نے دربار میں بڑا اثر حاصل کیا تھا، تخت سلطنت پر بیٹھا، اور سلطان جلال الدین خلجی کے نام سے مشہور ہوا، وہ بڑے عظمت و اقتدار و جاہ و جلال کا بادشاہ تھا، اسکے ساتھ نہایت صاحب مذاق، رنگیں طبع، خوش صحبت تھا، شعر بھی کہتا تھا، چنانچہ بدایونی نے اسکے دو شعر بھی نقل کیے ہیں،

آں زلف پریشانت ژولیدہ نمی خواہم | واں روئے چو گلنارت تفسیدہ نمی خواہم
بے پیرہنت خواہم یک شب بکنار آئی | ہاں بانگ بلندست ایں پوشیدہ نمی خواہم

احباب اور شریک صحبت بھی جسقدر تھے، سب قابل، اہل فن، موزوں طبع اور رنگیں مزاج تھے، مثلاً ملک تاج الدین کرجی، ملک فخر الدین، ملک اعزالدین، ملک قرابیگ، ملک نصرت، ملک حبیب ملک کمال الدین ابوالمعالی، ملک نصیرالدین کمرانی، ملک سعدالدین، انیس اور مصاحب تھے،

اسی طرح اکثر بڑے بڑے اہل کمال ندیمی کے لیے انتخاب کیے تھے، چنانچہ تاج الدین عراقی، خواجہ حسن دہلوی، موید جاجرمی، موید دیوانہ، امیر ارسلان، اختیار الدین باقی، ندمائے خاص میں تھے، ساقی، مغنی، اور مطرب بھی وہ لوگ تھے، مثلاً امیر خاصہ، حمید، راجہ، نظام، محمد شاہ، نصیر خاں، بہروز، ایسے گوناگوں صاحب مذاق بادشاہ کے دربار کے لیے امیر صاحب سے زیادہ کون موزوں ہو سکتا تھا وہ عالم بھی تھے، فاضل بھی، مغنی بھی، مطرب بھی، اور شاعر تو تھے ہی، معزالدین کیقباد کے زمانہ میں جب سلطان

[1] تاریخ فرشتہ ۱۲

جلال الدین عارض تھا، اُسی وقت اُس نے امیر صاحب کو قدردانی کی نگاہ دیکھا تھا، چنانچہ معقول مشاہرہ مقرر کرکے خاص اپنا لباس عنایت کیا تھا تخت پر بیٹھا تو امیر صاحب کو ندیم خاص بنایا اور مصحف[۱] داری اور عمارت کا عہدہ دیا، اسکے ساتھ جامہ اور کمربند جو امرائے کبار کا مخصوص لباس تھا انکے لیے مقرر کیا، امیر صاحب امیر کے خطاب سے پکارے جاتے ہیں۔ اسکی وجہ یہی ہے۔

امیر صاحب نے جلال الدین خلجی کے تمام فتوحات نظم کیے، اور تاج الفتوح نام رکھا، اسکی تفصیلی کیفیت آگے آئیگی، جلال الدین خلجی کو اسکے بھتیجے سلطان علاء الدین خلجی نے ۶۹۴ھ میں دھوکے سے قتل کرادیا، اور خود تخت نشین ہوا، سلطان علاء الدین نے اگرچہ دغا اور بےرحمی سے تخت سلطنت حاصل کیا تھا اور اگرچہ سخت دلی اور سفاکی اسکی طینت کا جوہر تھا تاہم بہت بڑے عزم استقلال، شوکت و شان کا فرمانروا گذرا ہے، تعجب انگیز فتوحات اور انتظامی کارناموں کو چھوڑکر علمی فیاضیاں بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں، اسکا دربار فقرا علماء فضلاء شعراء سے ہر وقت معمور رہتا تھا، ان میں بعض کے نام حسب ذیل ہیں،

قاضی فخر الدین ناقلہ، قاضی فخر الدین کرانی، مولانا نصیر الدین، غنی، مولانا تاج الدین مقدم، قاضی ضیاء الدین، مولانا ظہیر الدین لنگ، مولانا ظہیر الدین بھکری، قاضی زین الدین ناقلہ، مولانا تبرکتی، مولانا نصیر الدین رازی، مولانا علاء الدین صدر شریف، مولانا میراں باباسکلہ، مولانا نجیب الدین بیانوی، مولانا شمس الدین

---

[۱] جسکو قرآن مجید رکھنے کی خدمت سپرد ہوتی تھی اوسکو مصحف دار کہتے تھے ۱۲

[۲] یہ فہرست بداونی سے ماخوذ ہے ۱۲

مولانا صدرالدین، مولانا علاءالدین لاہوری، قاضی شمس الدین کارزونی، مولانا شمس الدین یحییٰ، مولانا شمس الدین، مولانا صدرالدین بادہ، مولانا عین الدین لولوی، مولانا افتخارالدین رازی، مولانا معیرالدین اندرپتی، مولانا نجم الدین، مولانا حمیدالدین بلوری، مولانا علاءالدین کرک، مولانا حسام الدین سادہ، محی الدین کاشانی، مولانا کمال الدین کولوی، مولانا وجیہ الدین کابلی، مولانا منہاج الدین، مولانا نظام الدین کلاتی، مولانا نصیرالدین کری، مولانا نصیرالدین بوبی، مولانا علاءالدین تاجر، مولانا کریم الدین جوہری، مولانا محب ملتانی، مولانا حمیدالدین، مولانا برہان الدین بھکری، مولانا افتخارالدین، مولانا حمیدالدین ملتانی، مولانا گل محمد شیرازی، مولانا حسام الدین سرخہ، مولانا شہاب الدین ملتانی، مولانا فخرالدین نسوی، مولانا فخرالدین تقافلی، مولانا علیم الدین،

قرّاء، مولانا شاطبی، مولانا علاءالدین سفری، خواجہ زکی،

واعظین، مولانا حسام الدین درویش، مولانا شہاب الدین، مولانا کریم،

شعراء، خواجہ حسن دہلوی، صدرالدین عالی، فخرالدین قواس، حمیدالدین راجہ، مولانا عارف عبدالحکیم، شہاب الدین، لیکن امیر صاحب کے آفتاب کمال نے ان ستاروں کو بے نور کر دیا تھا،

چنانچہ اس وسیع مرقع میں صرف امیر صاحب کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے انکے بعد اگر کسی کے خط و خال پہچانے جاتے ہیں تو وہ خواجہ حسن ہیں، کہ وہ بھی امیر صاحب ہی کا فیض ہے، علاءالدین نے امیر صاحب کا ایک ہزار سالانہ تنکہ[۱] مقرر کیا تھا۔ امیر صاحب نے سلطان علاءالدین کی تمام فتوحات کو

[۱] تاریخ فرشتہ، غالباً یہ طلائی سکہ ہوگا،

نہایت تفصیل سے لکھا، جسکا نام خزائن الفتوح ہے تفصیل آگے آئیگی۔

۶۹۸ھ میں امیر صاحب کی والدہ اور اُنکے بھائی حسام الدین نے انتقال کیا، چنانچہ لیلیٰ مجنوں میں اس واقعہ کو نہایت پُر درد مرثیہ کی صورت میں لکھا ہے، نظامی کی پنج گنج کا جواب اسی زمانہ میں لکھا، چنانچہ ہر کتاب سلطان علاء الدین کے نام سے معنون ہے، سب سے آخر کی مثنوی ہشت بہشت ہے جو ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی۔

اسی زمانہ میں امیر صاحب نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء (محبوب الٰہی) کے ہات پر بیعت کی، چنانچہ تفصیل آگے آئیگی۔ سلطان علاء الدین نے ۲۱ برس کی حکومت کے بعد ۷۱۶ھ میں وفات پائی، اسکے بعد اسکا بیٹا شہاب الدین (مدت حکومت ۳ ماہ) اور اسکے بعد ۷۱۷ھ میں قطب الدین مبارک بن علاء الدین خلجی، بادشاہ ہوا، وہ اگرچہ نہایت عیاش، بے مغز، اور سبک سر تھا، لیکن امیر صاحب کی قدردانی سب سے بڑھکر کی، چنانچہ امیر صاحب نے جب ۷۱۸ھ میں اسکے نام پر مثنوی نہ سپہر لکھی تو ہاتھی برابر تول کر روپے دیے، خود امیر صاحب قطب الدین کی زبان سے لکھتے ہیں،

تبارخ ہمچوں من اسکندرے	کند ہر کہ آرایشِ دفترے
ز گنج گراں مایۂ بے شمار	دہم بار بخشش نہ آں پیلبار
مرا خود دریں رہ پر رشد دلیل	کہ سید او زر، ہم ترازوئے پیل
نشاید کسے کش خرد رہنموں	کہ از پیلبار ست و زنقش فزوں
چو میراث شد پیل زر دادنم	نہ زیبا است زیں پیل تر دادنم

شہا! گنج بخشا! کرم گسترا! | معانی شناسا سخن داورا
چنیں بخششے کز تو ہم یافتم | در ایام پیشینہ کم یافتم
کنوں لابد ار سحر سنج چو من | : اندازۂ بخشش آمد سخن

قطب الدین خلجی نے ایک ہندو نومسلم غلام کو خسرو خاں کا خطاب دیکر قلمدان وزارت عطا کیا تھا، اسنے ۷۲۱ھ میں قطب الدین کو قتل کرکے خود تخت حکومت پر جلوس کیا، چونکہ اس نے دربار میں تمام ہندو بھر دیے اور خاندان شاہی پر طرح طرح کے ظلم کیے، امرا نے بغاوت کی، چنانچہ چار مہینے کی حکومت کے بعد ۷۲۱ھ میں غازی ملک کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

اب خلجی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، اور امرائے دربار میں سے غازی ملک نے جس کا باپ سلطان غیاث الدین بلبن کا ترکی غلام اور ماں اس کی ہندو تھی، دربار میں پکار کر کہا کہ مجکو تخت سلطنت کی آرزو نہیں، خاندان شاہی سے کسی کو تخت نشین کیا جائے۔ لیکن چونکہ خلجی خاندان میں سے کوئی شخص باقی نہیں رہا تھا اور ملک غازی کی خدمات کا تمام دربار معترف تھا، اسلیے سب نے بہ اتفاق اسی کو بادشاہ بنایا۔ وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہوا، اس نے نہایت عدل و انصاف سے حکومت کی اور نئی نئی فتوحات حاصل کیں، تغلق آباد کا مشہور قلعہ اسی کی یادگار ہے، امیر صاحب کی اس نے نہایت قدردانی کی اور انکو مال و دولت سے نہال کر دیا، امیر صاحب نے بھی اسکے احسانات کا حق ادا کیا، چنانچہ اسکے نام پر تغلق نامہ لکھا، جو تغلق کے عہد حکومت

کی مفصل تاریخ ہے۔

تغلق نے جب بنگال کا سفر کیا تو امیر صاحب ساتھ گئے، تغلق واپس آیا، لیکن امیر صاحب وہیں رہگئے، اسی اثناء میں خبر مشہور ہوئی کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے انتقال کیا، امیر صاحب یلغار کرتے ہوئے دلی میں آئے اور جو کچھ زرومال پاس تھا خواجہ صاحب کے نام پر نثار کردیا، ماتمی سیاہ کپڑے پہن کر خواجہ صاحب کی قبر پر مجاور ہو بیٹھے، چھ مہینے کے بعد ذیقعدہ ۷۲۵ھ میں انتقال کیا۔ خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میرے پہلو میں دفن کرنا۔ لوگوں نے اس وصیت کی تعمیل کرنی چاہی، لیکن ایک خواجہ سرا نے جو وزارت کا منصب رکھتا تھا کہا کہ لوگوں کو دونوں قبروں کی تمیز کرنے میں دھوکا ہوگا، غرض خواجہ صاحب کی پائنتی دفن کیا، اور اس سے زیادہ کیا خوش قسمتی ہوسکتی تھی۔ انکا مقبرہ مہدی خواجہ نے جو سلطان بابر کے امراء میں سے تھا تعمیر کیا[1] اور ملا شہاب معمائی نے تاریخ کہکر لوح پر کندہ کرائی۔

شد عدیم المثل یک تاریخ او ۔۔۔ داں دگر شد طوطئِ شکر مقال

امیر صاحب کو خدا نے فرزندان معنوی کے علاوہ اولاد ظاہری بھی عنایت کی تھی، انکے ایک صاحبزادہ کا نام ملک احمد ہے، وہ شاعر تھے اور سلطان فیروز شاہ کے دربار میں ندیم تھے، انکی شاعری نے چنداں فروغ نہیں حاصل کیا لیکن شعر اور شاعری کے دقائق سے خوب واقف تھے اشعار کے عیب و ہنر کو خوب پرکھتے تھے، اور نہایت نازک اور دقیق نکتے پیدا کرتے تھے، چنانچہ

[1] خزانۂ عامرہ ۔۱۲ [2] فرشتہ۔ حالات خسرو ۱۲

اکثر اساتذہ کے اشعار پر جو حرف گیریاں کیں عموماً اہل فن اسکو تسلیم کرتے تھے،
ظہیر کا شعر ہے،

کلاہ گوشۂ حکم تو از طریق نفاذ ربودہ از سر گردون کلاہ جباری

ملک موصوف نے ربودہ کو فگندہ سے بدل دیا جس سے مصرع کی ترکیب چست
ہو گئی - بخیل کی ہجو میں مشہور شعر ہے،

ایں سہل بود کہ گو گرد سرخ تو است گرنان خواجہ خواستی آں راچہ کرد مے

ملک صاحب نے یوں اصلاح دی،

ایں سہل سہل بود کہ آب حیات خواست گرنان خواجہ خواستی آں را چہ کردمے

نان کے ساتھ آب حیات کے مقابلے نے لطف پیدا کر دیا ایک اور شعر تھا:-

گر مشک خواند خاک درت را فلاک مریخ زرنج گہر بطعن خرد ابشاند ہ

ملک موصوف نے پہلے مصرعہ کو یوں بدل دیا،

گر لعل خواند سنگ درت مشتری مرنج،

لیکن انصاف یہ ہے کہ امیر صاحب کی یادگار سے ہم اس سے زیادہ توقع رکھتے تھے-
بدایونی نے ان اصلاحوں کو نقل کر کے سچ لکھا کہ ملک احمد چونکہ خسرو کی یادگار تھے
اسلیے بادشاہ اور درباری اسکو بھی امیر کا تبرک سمجھتے تھے اور غنیمت جانتے تھے۔

امیر صاحب کی ایک صاحبزادی تھیں لیکن سخت افسوس ہے کہ اُس زمانہ میں
عورتوں کی ایسی بیقدری تھی کہ امیر کو اُنکے پیدا ہونے کا رنج تھا، جب وہ سات
برس کی ہوئیں تو امیر صاحب نے لیلی مجنوں لکھی، اسمیں صاحبزادی سے خطاب کرتے ہیں

اے زعفنت فگندہ برقع نور ہم غنچہ بنام و ہم مستور

کاش مادر تو ہم بچہ بودے ۔ در رحم طفلِ ہشت مہ بودے
لیکن چوں دادۂ خدائے رواست ۔ با خداوندگاں ستیزہ خطاست
من پذیرفتم آنچہ یزداں داد ۔ کانچہ او داد باز نتواں داد،
پدرم ہم ز مادرست آخر ۔ مادرم نیز دخترست آخر،

پہلے آرزو کی ہے کہ کاش تم پیدا نہ ہوتیں، یا ہوتیں تو بیٹی کے بجائے بیٹا ہوتیں، پھر طرح طرح کی تاویلوں سے دل کو تسلی دی ہے کہ خدا کے دیے کو کون ٹال سکتا ہے، اور آخر میرا باپ بھی تو عورت سے پیدا ہوا، اور میری ماں بھی تو آخر عورت ہی تھی،

صاحبزادی کو جو نصیحتیں کی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں عورتوں کی حالت نہایت پست تھی، امیر صاحب اس قدر صاحب دولت و ثروت تھے، لیکن بیٹی سے کہتے تھے کہ خبردار چرخہ کاتنا نہ چھوڑنا، اور کبھی موکھے کے پاس بیٹھکر ادھر اُدھر نہ جھانکنا،

دوک و سوزن گذاشتن نہ فن است ۔ کالتِ پردہ پوشیِ بدن است
پا بدامانِ عافیت سر کُن ۔ رُو بدیوار و پشت بر در کُن
در تماشائے روزنت ہوس است ۔ روزنت چشمِ سوزنِ تو بس است

امیر صاحب کو اپنی والدہ سے بے انتہا محبت تھی، بڑی عمر کو بھی ہو چکے، وہ اس جوشِ محبت سے ماں سے ملتے تھے جس طرح چھوٹے بچے ماں سے لپٹ جاتے ہیں، اودھ کی معقول ملازمت صرف اس بنا پر چھوڑ دی کہ ماں دلّی میں تھیں اور اُنکو یاد کیا کرتی تھیں، اودھ سے جب دلّی میں آئے ہیں تو ماں سے ملنے کا حال اس جوش سے لکھا ہے کہ لفظ لفظ سے محبت کی شراب ٹپکتی ہے،

ایک موقع پر جب ماں سے ملے ہیں اور ماں نے سینہ سے لگایا ہے تو
ایک شعر بے اختیار زبان سے نکلا ہے. جسکا مطلب یہ ہے کہ ماں کا سینہ بہشت ہے
چنانچہ دو نہریں دودھ کی اس میں جاری ہیں، ۶۹۸ھ میں انھوں نے انتقال
کیا. اسی سال انکے چھوٹے بھائی حسام الدین نے بھی انتقال کیا، لیلیٰ مجنوں
میں دونوں کا مرثیہ ایک ساتھ لکھا ہے،

امسال دو نور ز اخترم رفت — ہم مادر و ہم برادرم رفت
یک ہفتہ ز بخت خفتۂ من — گم شد دو مہ دو ہفتۂ من
بخت از دو شکنجہ داد پیچم — چرخ از دو طپانچہ کرد ہیچم
ماتم دو شد و غم دو افتاد — فریاد کہ ماتم دو افتاد
حیف است دو داغ چون منی را — یک شعلہ بس است خرمنی را
یک سینہ دو بار بر نگیرد — یک سر دو خمار بر نگیرد
چون مادر من بزیر خاک است — گر خاک بسر کنم چہ باک است
اے مادر من کجائی آخر — روے از چہ نمی نمائی آخر
خندان ز دل زمین برون آے — بر گریۂ زار من ببخشاے
ہر جا کہ ز پاے تو غباریست — ما را ز بہشت یادگاریست
ذات تو کہ حفظ جان من بود — پشت من و پشتبان من بود
دور تو کہ لب تو در سخن بود — پند تو صلاح کار من بود
امروز منم بہ مہر پیوند — خاموشی تو ہمی دہد پند

اڑتالیس (۴۸) برس کی عمر میں ماں کو اس طرح یاد کرتے ہیں جس طرح کمسن بچہ ماں کیلئے بلکتا ہے

اس سے آگے بھائی کے مرثیہ کے شعر ہیں اور وہ بھی خون جگر سے رنگین ہیں۔

امیر صاحب اگرچہ خاندان کے اثر سے شاہی دربار سے تعلق رکھتے تھے، اور اسی قسم کی زندگی بسر کرتے تھے جو عام دنیا داروں کا طریقہ ہے، لیکن یہ امر اُنکی اصل فطرت کے خلاف تھا۔ دربارداری۔ خوشامد اور نفس پرستی سے انکو طبعی نفرت تھی اور موقع بموقع یہ خیالات بے اختیار اُنکی زبان سے نکل جاتے تھے، لیلیٰ مجنوں ۶۹۸ھ میں لکھی تھی، جب انکو سلطان علاءالدین خلجی جیسے جبار بادشاہ سے تعلق تھا، تاہم خاتمہ میں لکھتے ہیں۔

شب تا سحر و ز صبح تا شام　　　در گوشۂ غم نگیرم آرام

با تشم ز بہلے نفس خود رسلئے　　　پیش چو خودے ستادہ برپلئے

اسپر مزید یہ ہوا کہ اُنکے والد نے انکو آٹھ برس کی عمر میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے قدموں پر ڈال دیا تھا اور برکت کے لیے بیعت کرا دی تھی، حضرت خواجہ کی روحانی تاثیر چپکے چپکے اپنا کام کرتی جاتی تھی۔ امیر صاحب کی طبیعت میں عشق و محبت کا مادہ بھی ازلی تھا، وہ سرتاپا عشق تھے، اور یہ بجلی اُنکی رگ رگ میں کوندتی پھرتی تھی، آخر یہ نوبت پہونچی کہ ۷۱۲ھ میں جیسا کہ خود افضل الفوائد میں لکھا ہے خواجہ صاحب کے ہات پر دوبارہ بیعت کی، خواجہ صاحب نے چار گوشہ کی ٹوپی جو اس سلسلہ کی نشانی تھی عنایت کی، اور مریدانِ خاص میں داخل کیا، قدرت اللہ قدرت نے طبقات الشعرا میں لکھا ہے کہ امیر صاحب نے جب خواجہ صاحب سے بیعت کی تو جو کچھ نقد اور اسباب تھا، سب لٹا دیا اور پاکدامن ہوکے بیٹھ گئے۔

خواجہ صاحب سے امیر صاحب کی ارادت اور عقیدت عشق کے درجے تک پہونچ گئی تھی، ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے تھے، اور گویا انکا جمال دیکھکر جیتے تھے۔ خواجہ صاحب کو بھی انکے ساتھ یہ تعلق تھا کہ فرمایا کرتے تھے کہ جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا ہے تو خسرو کو پیش کر دونگا۔ دعا مانگتے تھے تو خسرو کی طرف اشارہ کرکے فرماتے تھے، الٰہی! بسوزِ سینۂ ایں ترک مرا ببخش،

ایک دفعہ خواجہ صاحب لب دریا ایک کوٹھے پر بیٹھکر ہندوؤں کی عبادت اور اشنان کا تماشا دیکھ رہے تھے، امیر خسرو صاحب بھی حاضر تھے خواجہ صاحب نے فرمایا دیکھتے ہو؟ ع

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے،

اُسوقت خواجہ صاحب کی ٹوپی ذرا ٹیڑھی تھی امیر صاحب نے اُسکی طرف اشارہ کرکے برجستہ کہا، ع

ما قبلہ راست کردیم برطرف کجکلاہے،

جہانگیر نے، تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ میری مجلس میں قوال یہ شعر گا رہے تھے، میں نے اسکا شان نزول پوچھا، ملا علی احمد مہر کن نے واقعہ بیان کیا، مصرع آخر کے ختم ہوتے ہوتے ملا کی حالت بدلنی شروع ہوئی، یہانتک کہ غش کھاکر گرے دیکھا تو دم نہ تھا۔

خواجہ صاحب نے امیر صاحب کو ترک اللہ کا خطاب دیا تھا، اور اسی

ﮥ تزک جہانگیری صفحہ ۱۸۳۔ مطبوعہ علی گڈھ۔

لقب سے پکارتے تھے۔ امیر صاحب نے جا بجا اس پر فخر کیا ہے، چنانچہ ایک قصیدہ میں جو خواجہ صاحب کی مدح میں ہے فرماتے ہیں،

برزبانت چوں خطاب بندہ ترک اللہ رفت ۔۔۔ دست ترک اللہ گیرد ہم باللش سپار

خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میری قبر کے پہلو میں دفن کرنا، یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر ایک قبر میں دو لاشوں کا دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی ہی قبر میں انکو بھی دفن کرتا۔

امیر صاحب نے تصوف میں جو مدارج حاصل کیے انکو نہ ہم جان سکتے ہیں اور نہ بیان کر سکتے ہیں۔ یہ البتہ نظر آتا ہے کہ امیر صاحب کا ہر شعر جو بجلیاں گراتا ہے وہ اسی وادیٔ ایمن کی شرر باریاں ہیں،

امیر صاحب کی صوفیانہ زندگی کا ایک بڑا واقعہ حسن لوی کے تعلقات ہیں حسن نہایت صاحب جمال تھے اور نان بائی کا پیشہ کرتے تھے۔ امیر صاحب کا عین شباب تھا کہ ایک دن اتفاق سے انکی دوکان کے سامنے سے گزرے آفتاب حسن کی شعاعیں امیر پر بھی پڑیں، وہیں ٹھیر گئے اور پوچھا کہ کس حساب سے روٹی بیچتے ہو؟ حسن نے کہا کہ ایک پلڑے پر روٹی رکھتا ہوں اور خریدار سے کہتا ہوں کہ دوسرے میں سونا رکھے۔ سونے کا پلہ جھک جاتا ہے تو روٹی حوالہ کر دیتا ہوں، امیر نے کہا اور اگر خریدار مفلس ہو؟ حسن نے کہا تو سونے کے بدلے درد و نیاز لیتا ہوں۔ اس انداز گفتگو نے امیر صاحب کو اور بھی بے اختیار کر دیا، فوراً حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا۔ حسن نے گو ناوک اندازی کی تھی لیکن خود بھی شکار ہو گئے، اسی وقت دوکان بند کرکے

خواجہ صاحب کی خدمت میں پہنچے، اور اپنے دلدادہ (امیر خسرو) سے ملے اسی تعلق سے خواجہ صاحب کی خدمت میں اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔[۱]

امیر صاحب سے اسقدر تعلقات بڑھے کہ دونوں ایک دم کے لیے بھی جدا نہیں ہوتے تھے، امیر صاحب نے جب خان شہید کی ملازمت کی تو حسن بھی ساتھ ملازم ہوے، چنانچہ جب ملتان میں خان شہید کو تاتاریوں نے ہلاک کیا تو امیر صاحب کے ساتھ حسن بھی اس موقع پر موجود تھے دونوں کے تعلقات کا چرچا زیادہ پھیلا تو لوگوں نے خان شہید سے شکایت کی، امیر صاحب نے اس واقعہ پر یہ غزل لکھی،

خسروا فرمانِ دل بردن ہمیں بار آورد ۔۔۔ زیں دلِ خودکام کارِ من برسوائی کشید

خان شہید نے بدنامی کے خیال سے حسن کو امیر صاحب کے ملنے سے منع کردیا، لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ خان شہید نے غصہ میں آکر حسن کے ہات پر کوڑے لگوائے۔ حسن سیدھے امیر صاحب کے پاس گئے، خان شہید کو اُسی وقت پرچہ لگا، نہایت متحیر ہوا۔ اور امیر صاحب کو بلوا بھیجا۔ آئے تو کہا کہ کیا حالت ہے؟ امیر نے آستین سے ہات نکال کر دکھایا اور کہا، ع

گواہِ عاشقِ صادق در آستیں باشد

[۱] یہ واقعہ اکثر تاریخوں اور تذکروں میں منقول ہے، لیکن صاحب بہارستان سخن نے اسکی معقول بنا پر تکذیب کی ہے اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی یہ عبارت نقل کی ہے "بقیاس چناں درمی آید کہ حسن را نسبت امیر خسرو گونہ تقدم باشد، چہ امیر حسن را در مدح سلطان غیاث الدین بلبن قصائد است و در کلام امیر خسرو در مدح سلطان کمتر چیزے متواں یافت"۔ ۱۲

دیکھا تو جہاں حسن کے کوڑے لگے تھے وہیں امیر صاحب کے ہات پر بھی کوڑے کے نشان تھے۔

چونکہ حسن کا تذکرہ ہم الگ نہیں لکھتے، اور صنف غزل پر انکا خاص احسان ہے، اسلیے انکے شیدائی، امیر صاحب ہی کے تذکرہ میں انکے اشعار نقل کرتے ہیں

خلق گویند، دل از صبر بجا آور باز — ای دل، از صبر نشانی دہ اگر جائے ہست
آنکہ نظارۂ دیوانہ نگردی ہرگز — قدت رنجہ کن این کوئے کہ رسوائے ہست

بر چوں تو، کسے دگر گزیدن — کارے دگرست، کارِ من نیست
گفتی کہ چرا جدائی از من — این از فلک است، از حسن نیست

باز این دلم بسوئے دلارام میرود — از دام جستہ، باز سوئے دام میرود
ایام در نیامد با ما بہ دوستی — دوں شوخ ہم بہ سیرتِ ایام میرود

اے خواجہ با درمحلہ تقویٰ قیام گیر — در کوئے عاشقی نتوان نیکنام شد
عقلم کہ زین برابلق ایام می نہاد — آخر بتازیانۂ عشقِ تو رام شد

طرفہ سرو کارے ہست کہ با دعدہ معشوق — صابر نتوان بود و تقاضا نتوان کرد

از حسن این چہ سوال ہست کہ معشوق تو کیست — این سخن را چہ جواب ہست، تو ہم میدانی

دو سہ بار با تو گفتم کہ مرا بہیچ بستاں ؛ نہ شد اتفاق، شاید کہ بایں بہا گرانم

تلخ کردم جہانیاں را خواب ؛ زاں دعا ہا کہ مستجاب نبود

اے حسن یار اگر خطاے کرد ؛ ہم شکایت ازو، صواب نبود

بہ تقوے نامِ نیکو بدہ بودم ؛ نکورویاں، مرا بدنام کردند

گفتی کہ چرا حالِ دلِ خویش نگوئی ؛ من خود کنم آغاز، بپایاں کہ رساند؟

ان اشعار سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جو سوز و گداز، اور جذبہ و اثر، انکے کلام میں موجود ہے انکے کشتۂ محبت (امیر صاحب) میں بھی نہیں۔

جامعیت اور کمالات ہندوستان میں چھ سو برس سے آجتک، اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا، اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع، ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کیے ہوں گے۔ صرف ایک شاعری کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے، فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی، نظیری بے شبہ اقلیمِ سخن کے جم وکے ہیں، لیکن اُنکی حدودِ حکومت، ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتی، فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا، سعدی قصیدہ کو ہات نہیں لگا سکتے، انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا، حافظ، عرفی، نظیری غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے، لیکن امیر صاحب کی جہانگیری میں غزل،

مثنوی، قصیدہ، رباعی سب کچھ داخل ہے، اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی تضمین، مستزاد اور صنائع وبدائع کا تو شمار نہیں، تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو اِنکی ہمسری کا دعوی نہیں ہو سکتا۔ فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے، صائب نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ نہ کہے ہیں، لیکن امیر صاحب کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں۔ اکثر تذکروں میں خود امیر صاحب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ انکا کلام تین لاکھ سے زیادہ اور چار لاکھ سے کم ہے، لیکن اس میں غالبًا ایک غلط فہمی ہے، امیر صاحب نے ابیات کا لفظ لکھا ہے اور قدما کے محاورہ میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں، چنانچہ نثر کی کتابوں کے متعلق یہ تصریحیں جابجا نظر آتی ہیں کہ اس میں اسقدر بیتیں ہیں،

ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرۂ عرفات میں لکھا ہے کہ امیر صاحب کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اُسی قدر برج بھاکا میں ہے۔ کس قدر افسوس ہے کہ اس مجموعہ کا آج نام و نشان بھی نہیں،

مختلف زبانوں کی زباندانی کا یہ حال ہے کہ ترکی اور فارسی اصلی زبان ہے عربی میں ادبائے عرب کے ہمسر ہیں، سنسکرت کے ماہر ہیں، چنانچہ مثنوی نہ سپہر میں تواضع کے لہجہ میں اسکا ذکر کیا ہے،

من قدرے بر سرآں کار شدم

شاعری کے بعد نثاری کا نمبر ہے۔ اُسوقت تک کسی نے نثر لکھنے کے اصول اور قاعدے نہیں مرتب کیے تھے۔ انھوں نے ایک مستقل کتاب اعجازِ خسروی تین جلدوں میں لکھی، اور اگرچہ افسوس ہے کہ زیادہ تر زور صنائع وبدایع پر بکار

گیا، لیکن ذکی طباعی اور ذہانت سے کون انکار کر سکتا ہے

موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب انکے بعد آجتک پھر کوئی شخص حاصل نہ کر سکا، چنانچہ اسکی تفصیل مستقل عنوان میں آتی ہے،

ان مختلف الحیثیات مشغلوں کے ساتھ فقر و تصوف کا یہ رنگ ہے کہ گویا عالم قدس کے سوا دنیاے فانی کو نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ چنانچہ اسکا ذکر بھی الگ عنوان میں آئے گا،

ان سب باتوں کے ساتھ جب اسپر نظر کی جاتی ہے کہ ان کاموں میں مشغول ہونے کے لیے وقت کس قدر ملتا تھا، تو سخت حیرت ہوتی ہے، وہ ابتدا سے ملازمت پیشہ تھے اور دربار دل میں تمام دن حاضری دینی پڑتی تھی، کام جو سپرد تھا، وہ شاعری نہ تھی، بلکہ اور اشغال تھے، لیلیٰ مجنوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں،

مسکین من مستمند مدہوش   از سوختگی چو دیگ پُر جوش

شب تا سحر و ز صبح تا شام   در گوشۂ غم نگیرم آرام

استم ز بلاے نفس خود راے   پیش چو خودے ستادہ بر پاے

(یعنی نفس پروری کی وجہ سے اپنے ہی جیسے کے آگے صبح سے شام تک مودب کھڑا رہتا ہوں)

تا خوں نہ رود ز پاے تا سر   دستم نہ شود ز آب کس تر

جب تک پاؤں کا پسینہ سر تک نہیں پہنچتا، کھانا کھانے کو نہیں ملتا،

ان حالات کے ساتھ اگر صانعِ قدرت اُنکے پیدا کرنے پر ناز کرے، تو چنداں ناموزوں نہ ہوگا،

موسیقی امیر صاحب کی ہمہ گیر طبیعت نے اس نازک اور لطیف فن پر بھی

بھی توجہ کی اور اس درجہ تک پہنچایا کہ چھ سو برس کی وسیع مدت نے بھی ان کا جواب پیدا نہ کیا، انکے زمانہ کا مشہور جگت اُستاد جو تمام ہندوستان کا اُستاد تھا نایک گوپال تھا، اسکے بارہ سو شاگرد تھے جو اسکے سنگھاسن یعنی تخت کو کہاروں کی طرح اُٹھا کر لے چلتے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے اسکے کمال کا شہرہ سنا تو دربار میں بلایا، امیر صاحب نے عرض کی کہ میں تخت کے نیچے چھپ کر بیٹھتا ہوں، نایک گوپال سے گانے کی فرمایش کی جائے، نایک نے چھ مختلف جلسوں میں اپنا کمال دکھایا، ساتویں دفعہ امیر صاحب بھی اپنے شاگردوں کو لیکر دربار میں آئے، گوپال بھی انکا شہرہ سُن چکا تھا، ان سے گانے کی فرمایش کی، امیر صاحب نے کہا میں مغل ہوں، ہندوستانی گانا یونہی سا جانتا ہوں، پہلے آپ کچھ سنائیں تو میں بھی کچھ عرض کروں گا،

گوپال نے گانا شروع کیا، امیر صاحب نے کہا یہ راگ تو مدت ہوئی میں باندھ چکا ہوں، پھر خود اُسکو ادا کیا۔ گوپال نے دوسرا راگ شروع کیا، امیر صاحب نے اُسکو بھی ادا کر کے بتایا کہ مدتوں پہلے میں اسکو ادا کر چکا ہوں، غرض گوپال جو راگ راگنی اور سُر ادا کرتا تھا، امیر صاحب اُسکو اپنا ایجاد ثابت کر جاتے تھے، بالآخر کہا کہ یہ تو عام بازاری راگ تھے، اب میں اپنے خاص ایجادات سناتا ہوں، پھر جو گانا شروع کیا تو گوپال مبہوت ہو کر رہ گیا[۱]

[۱] عالمگیری عملا میں فقیر اللہ جسکا لقب سیف خاں تھا، ایک مشہور امیر تھا۔ ناصر علی نے اسی کی شان میں کہا ہے:۔ گفتگوے طوطی از آئینہ می خیزد علی گر نباشد سیف خاں مارا نفس درکار نیست
وہ موسیقی کا بڑا ماہر تھا، فن موسیقی کی ایک مستند کتاب مانک سوہل تھی فقیر اللہ نے اُسکا فارسی میں ترجمہ

امیر صاحب چونکہ ہندی کے ساتھ فارسی راگوں سے بھی واقف تھے اسلیے انھوں نے دونوں موسیقی کو ترکیب دیکر ایک نیا علم پیدا کر دیا، چنانچہ اُنکے ایجاد کردہ راگ حسب ذیل ہیں[1]۔

نام راگھائے مخترع امیر خسروؒ	کن راگوں سے مرکب ہے
مجیر،	غار اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے،
سازگری،	پوربی، گورا، کنگلی اور ایک فارسی راگ، قران السعدین میں اسکا ذکر کیا ہے، چنانچہ کہتے ہیں

ع زمزمۂ سازگری در عراق ؛ کردہ بہ گلبانگِ عراق اتفاق۔

ایمن،	ہنڈول اور نیریز،
عُشاق،	سارنگ اور بسنت اور نوا،
موافق،	توڑی، مالری و دوگاہ و حسینی،
غنم،	پوربی میں ذرا تغیر کر دیا ہے،
زیلف،	کھٹ راگ میں شہناز کو ملایا ہے،
فرغنہ،	گنگلی اور گورا میں فرغانہ ملایا ہے،

(بقیہ صفحہ ۲۹) ترجمہ کیا اور بہت سے فوائد اضافہ کیے اور اسکا نام راگ درپن رکھا۔ چنانچہ آثر الامراء جلد دوم صفحہ ۹۰۷، ۲۴ مطبوعۂ کلکتہ میں تفصیل مذکور ہے، اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ میرے پاس ہے اور ایک ندوہ کے کتبخانہ میں ہے گوپال کا واقعہ اور آئندہ امیر خسرو کی ایجادات میں نے اسی نسخہ سے لیے ہیں ۱۲

[1] راگ درپن کے دو نسخے جو میرے استعمال میں ہیں، دونوں غلط ہیں اسلیے راگوں کے نام صحیح نہیں پڑھے گئے، اس لیے کہیں کہیں میں نے صرف صورت نویسی کر دی ہے ۱۲

نام راگ ہائے مخترع امیر خسرو	کن راگوں سے مرکب ہے
سرپردہ،	سازنگ، بلاول، اور راست کو ترکیب دیا ہے،
باخرز	دیسکار میں ایک فارسی راگ ملا دیا ہے،
فرودست (یا) پھردوست	کانہڑا، گوری، پوربی اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے،
منم	کلیان میں ایک فارسی راگ شامل کیا ہے،

راگ درپن میں لکھا ہے کہ ان راگوں میں سازگری، باخرز، عشاق اور موافق میں موسیقی کا کمال دکھایا ہے، باقی راگوں میں کچھ یوں ہی ادل بدل کرکے دوسرا نام رکھدیا ہے۔ قول، ترانہ، خیال، نقش، نگار، بسیط، تلانہ، سوہلہ، یہ سب بھی امیر صاحب کی ایجاد ہیں، ان میں سے بعض خاص اُنکی ایجاد ہیں، بعض کے نام ہندی میں پہلے موجود تھے، امیر صاحب نے ان میں کچھ تصرف کرکے نام بدل دیا۔

تصانیف جامی نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ امیر صاحب نے ۹۲ کتابیں تصنیف کیں، یہ بھی مشہور ہے کہ امیر صاحب نے خود کسی کتاب میں تصریح کی ہے کہ میرے اشعار پانچ لاکھ سے کم اور چار لاکھ سے زیادہ ہیں۔ امیر صاحب کی کثرت تصنیف سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن بیانات مذکورۂ بالا مبالغہ سے خالی نہیں، چار پانچ لاکھ اشعار کی یہ کیفیت ہے کہ قدیم زمانہ میں سطر کو بیت کہتے تھے، اور یہ استعمال نہایت کثرت سے مروج ہے، اس بنا پر اُنکی ہر قسم کی تصانیف کی ۴۔ ۵ لاکھ سطریں

ہوں، تو چنداں تعجب نہیں، لوگوں نے بیت اور شعر کو مرادف سمجھکر بیت کی جگہ شعر لکھدیا۔ ہندی کلام مدوّن نہیں ہوا، اسلیے مبالغہ کے لیے کافی موقع ہے، بہر حال جس قدر تصنیفات آج ملتی ہیں وہ بھی کم نہیں، اُنکی تفصیل حسب ذیل ہے،

دیوان تحفۃ الصغر[۱] — اسکے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ یہ سب سے پہلا دیوان ہے جس میں ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس تک کا کلام ہے،

دیوان وسط الحیات — اس میں ۲۰ برس کی عمر سے ۳۲ یا ۳۴ برس تک کا کلام ہے، اس میں جو قصائد ہیں، سلطان شہید (کشلو خاں) وغیرہ کی مدح میں ہیں۔

غرۃ الکمال — یہ دیوان اپنے بھائی علاء الدین علی خطاط کے اصرار سے مرتب کیا، ۳۴ برس کی عمر یعنے ۶۸۵ھ سے تقریباً ۶۹۵ھ تک کا کلام ہے، دیباچہ میں اپنی مختصر سی سوانح عمری لکھی ہے سلطان معز الدین کیقباد اور جلال الدین خلجی کے مدحیہ قصائد

---

[۱] امیر صاحب نے اپنے چاروں دیوانوں کے دیباچوں میں تصنیف کے متعلق کچھ کچھ بیانات بھی لکھے ہیں، تحفۃ الصغر اور غرۃ الکمال کا دیباچہ اسوقت میرے پیش نظر ہے اور دو دیوانوں کے دیباچے بھی نظر سے گذرے ہیں لیکن اسوقت سامنے نہیں، اسلیے انکی نسبت میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ ڈاکٹر ریو (آر۔ آئی۔ ری، وی) کے اُس ریویو سے ماخوذ ہے جو اُنھوں نے برٹش میوزیم کے کتبخانے کی فہرست میں لکھے ہیں، اس اطلاع کے متعلق میں مولوی عبد القادر پروفیسر پونہ کالج کا ممنون ہوں۔

بقیہ نقیہ ہیں، دو ہفتہ میں اسکی ترتیب دی اور دیباچہ لکھا، بڑھاپے کا کلام ہے۔ تاریخ تالیف مذکور نہیں لیکن سلطان علاء الدین خلجی کا مرثیہ اس میں موجود ہے اسلیے کم از کم ۷۱۵ھ کے بعد تک کا کلام ہے،

نہایۃ الکمال پانچواں دیوان ہے، اسمیں غزلوں کے علاوہ قطب الدین مبارک خلجی المتوفی ۷۲۰ھ کا مرثیہ اور اسکے ولیعہد کی مدحیں ہیں۔ ایک قصیدہ میں ۷۲۵ھ کا ایک واقعہ مذکور ہے اور اسی سن میں جناب امیر خسرو نے انتقال کیا ہے۔

قران السعدین سب سے پہلی مثنوی ہے ۶۸۸ھ میں جبکہ مصنف کی عمر ۳۶ برس کی تھی لکھی۔ کیقباد اور بغرا خاں کے مراسلات اور صلح و ملاقات کا حال ہے،

مطلع الانوار مخزن الاسرار کا جواب ہے، سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر لکھی، ۳۳۱۰ شعر ہیں، دو ہفتہ میں تمام ہوئی، سال اختتام ۶۹۸ھ ہے تصوف کے مضامین ہیں اور پنج گنج کے سلسلہ کی پہلی کتاب ہے۔

شیرین خسرو	رجب سنہ ۶۹۸ھ میں تمام ہوئی۔ ۴۱۲۴ شعر ہیں
آئینۂ اسکندری	سکندر نامہ کا جواب ہے، سال اختتام سنہ ۶۹۹ھ ہے۔ اشعار کی تعداد ۴۴۵۰،
لیلیٰ مجنوں	۲۶۶۰ شعر ہیں، سنہ ۶۹۸ھ میں ختم ہوئی۔
ہشت بہشت	سلسلۂ پنج گنج کی سب سے اخیر مثنوی ہے ہفت پیکر نظامی کا جواب ہے، سنہ ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی ۳۳۸۲ شعر ہیں، پورا خمسہ سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر ہے کل ۱۸ ہزار شعر ہیں، خمسۂ نظامی میں ۲۸ ہزار شعر ہیں، پانچوں کتابیں دو برس کی مدت میں تمام ہوئیں۔
تاج الفتوح	سلطان جلال الدین فیروز شاہ کی تخت نشینی کے سال اول یعنی سنہ ۶۸۹ھ سے جمادی الآخر سنہ ۶۹۰ھ تک کے حالات ہیں، اور اسی سنہ میں یہ مثنوی تمام بھی ہوئی، مطلع یہ ہے سخن بر نام شاہے کردم آغاز
نُہ سپہر	قطب الدین خلجی کے نام پر ہے۔ نُو باب ہیں اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے اس مناسبت سے نُو سپہر نام رکھا ہے۔ اسوقت امیر خسرو

	کی عمر ۶۶ برس کی ہو چکی تھی، سنہ ۷۱۸ھ میں تمام ہوئی۔
دول رانی و خضر خاں	دول رانی۔ گجرات کے راجہ کی لڑکی تھی، خضر خان سلطان علاء الدین کا بیٹا تھا، وہ دیول رانی پر عاشق ہو گیا تھا اور اس سے شادی کی، خضر خاں نے خود یہ حالات بطور یادداشت کے لکھے تھے، اُنکی فرمائش سے امیر صاحب نے اسکو نظم کا لباس پہنایا اور عشقیہ نام رکھا، چار مہینے میں تمام ہوئی، ۴۲۰۰ شعر تھے، خضر خاں کے مرنے پر دول رانی کو جو واقعات پیش آئے، اُنکو لکھا تو ۳۱۹ شعروں کا اضافہ ہوا، سنہ ۷۱۵ھ میں تمام ہوئی۔
افضل الفوائد،	خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات ہیں،
اعجاز خسروی	نثر نویسی کے اصول اور قواعد منضبط کیے ہیں اور سینکڑوں صنعتیں اختراع کی ہیں، سنہ ۷۱۹ھ میں تمام ہوئی۔ تین جلدوں میں ہے،
تغلق نامہ	غیاث الدین تغلق کے حالات اور فتوحات ہیں۔
خزائن الفتوح	سلطان علاؤ الدین کے فتوحات ہیں۔
مناقب ہند۔ تاریخ دہلی،	ان کتابوں کا ذکر دولت شاہ نے کیا ہے۔

دولت شاہ نے لکھا ہے کہ اِن تصنیفات کے علاوہ فن حساب، اور فن موسیقی میں بھی اُنکی تصنیفیں ہیں۔

شاعری
امیر صاحب اگرچہ ہندی نژاد تھے، لیکن ایرانی شعرا کو بھی انکی شاعری اور زبان دانی کا اعتراف کرنا پڑا، جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ خمسہ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا۔ طوطیِ ہند جو اُن کا خطاب تھا، ایرانی بھی اسی خطاب سے اُنکو یاد کرتے ہیں۔

عرفی

بروحِ خسرو ازیں پارسی شکر دادم — کہ کامِ طوطیِ ہندوستاں شود شیریں

خواجہ حافظ

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند — زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

آذری نے جواہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی شیرازی خسرو سے ملنے کے لیے شیراز سے دہلی میں آئے۔ اگرچہ یہ روایت قرین قیاس نہیں، اور بعض تذکرہ نویسوں نے صراحۃً اس واقعہ سے انکار کیا ہے۔ تاہم اس سے اسقدر ثابت ہوتا ہے کہ آذری کے نزدیک خسرو اس پایہ کے شخص تھے کہ سعدی کا انکی ملاقات کے لیے سفر کرنا ممکن تھا، اور اس قدر تو تمام تذکرہ نویسوں کو تسلیم ہے کہ جب سلطان شہید نے سعدی کو شیراز سے بُلایا تو انھوں نے بڑھاپے کا عذر کیا اور لکھ بھیجا کہ خسرو جوہر قابل ہیں اُنکی تربیت کی جائے، اُسوقت اُنکی عمر تیس برس سے زائد نہ تھی،

تاہم بعض بعض ایرانی شعرا قومی تعصب کو چھپا نہیں سکے، عبید ایک

شاعر جو امیر کا معاصر ہے کہتا ہے

غلط افتاد خسرو را ز نظامی   کہ سکہ بخت در دیگ نظامی

امیر صاحب کی شاعری قدرتی تھی، وہ ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوئے تھے، اُنکے باپ دادا، شاعری سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھتے تھے، بلکہ قلم کے بجائے تیغ سے کام لیتے تھے۔ تاہم امیر کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تھے کہ اُنکی زبان سے بے اختیار شعر نکلتے تھے، دیباچہ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں،

دراں صغر سن کہ دنداں بی اُفتاد، سخن می گفتم وگوہر از دہانم می ریخت

دیوان تحفۃ الصغر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں،

چوں مرا اُستادے سر آمد بر سر نیامدہ بود کہ بر سر دقائق دال شدے

و آہوے مشکبار قلم را از سواد خطا باز آوردے "

ایک مدت تک یوں ہی بطور خود لکھتے رہے، اُستاد کے بجائے اساتذہ کے دیوان کو سامنے رکھکر انکا تتبع کرتے تھے، جس دیوان کا مطالعہ کرتے تھے اسی انداز پر کہنا شروع کرتے۔ خاقانی کا کلام دیکھا تو بہت مغلق نظر آیا، اُسکے الفاظ حل کیے۔ لیکن خود تحفۃ الصغر میں لکھتے ہیں کہ اُسکا تتبع نہ ہوسکا۔ پہلا دیوان بالکل بے اصلاحی ہے، امیر صاحب اسکو مرتب کرنا بھی نہیں چاہتے تھے، لیکن بھائی کی خاطر سے مجبور ہوگئے۔

لیکن بالآخر وہ اپنا کلام اساتذہ کو دکھلانے لگے ہشت بہشت کے خاتمہ میں تصریح کی ہے کہ یہ کتاب شہاب کی اصلاح یافتہ ہے۔ شہاب کی پہلے

نہایت تعریف کی ہے، پھر لکھتے ہیں،

من بہ عرضہ کردہ نامۂ خویش — او باصلاح راندہ خامۂ خویش
دیدہ ہر نکتہ را رقم بہ رقم — رنج بر خود نہادہ و منت ہم
نقطہ ہا تیز کردہ موے شگاف — نے بہ عمیا نظارۂ گزاف
این دقائق کہ شد ز مغزش پوست — مو بمو شعر سبز کردۂ اوست
شمع من یافتہ ضیا از وے — مس من گشتہ کیمیا از وے
ہر چہ او گفت من نہادم گوش — برکشیدم کمی ز شربتِ نوش
وانچہ ننمود من نہ جستم پے — عیب آن بر من است نہ بر وے
یارب او چون بہ پنج نامۂ من — برد بیرون خطائے خامۂ من
نامۂ او کہ عذر جانش باد — در قیامت خطِ امانش باد

اخیر کے شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچوں مثنویاں شہاب کی اصلاح دادہ ہیں
یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امیر صاحب نرے مقلد نہ تھے۔ جہاں انکو اصلاح کی وجہ
سمجھ میں نہیں آتی تھی وہاں اُستاد کی رائے تسلیم نہیں کرتے تھے، گو ادب کا پاس
اب بھی ملحوظ رکھتے تھے۔

عیب آن بر من است نہ بر وے،

کیا عجیب بات ہے، وہ اُستاد جسکے دامنِ تربیت میں آپ جیسا شخص پلا
بڑا ہو، آج اُسکا نام و نشان تک معلوم نہیں۔

معاصر اُستادوں کے علاوہ امیر صاحب نے قدیم اساتذہ سے بھی بہت
فیض حاصل کیا ہے وہ اُنکے کلام کو سامنے رکھکر کہتے تھے، اور اسی طرح

اُس سے فائدہ اُٹھاتے تھے جس طرح کوئی شاگرد زندہ اُستاد سے شاعری سیکھتا ہے۔ اسی بنا پر لیلیٰ مجنوں میں نظامی کی نسبت لکھتے ہیں ؛

زندہ است بمعنی اُوستادم در نیست بنقش حیات دادم

شیخ سعدی سے استفادہ کا اشارہ کرتے ہیں ؛

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بُو

تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ امیر صاحب جوانی کے جوش میں اکثر اساتذہ کی شان میں گستاخی کرتے تھے، چنانچہ جب مطلع الانوار لکھتے ہوئے یہ شعر کہا،

کوکبۂ خسرویم شد بلند زلزلہ در گورِ نظامی فگند

تو غیب سے ایک تلوار نکلی اور خسرو کی طرف بڑھی، خسرو نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا نام لیا، دفعتًہ ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اُسنے آستین تلوار کے سامنے کر دی، تلوار آستین کو کاٹتی ہوئی ایک بیری کے درخت پر جا لگی واللہ اعلم[۱]۔

خسرو نے مطلع الانوار ۶۹۸ھ میں لکھی ہے۔ اُسوقت اُنکی عمر ۴۴ برس کی ہو چکی تھی، یہ شباب کا زمانہ کہاں ہے، شباب کے زمانہ میں اُنھوں نے غرۃ الکمال مرتب کیا ہے اُسکے دیباچہ میں صاف لکھتے ہیں کہ میں مثنوی میں **نظامی** کا پیرو اور شاگرد ہوں۔

اسی زمانہ میں قران السعدین لکھی اُس میں لکھتے ہیں۔

نظم نظامی بلطافت چو دُر وزدرِ او سر بسر آفاق پُر

پختہ ازو شد چو معانی تمام خام بود پختن سودائے خام

[۱] یہ واقعہ جسقدر عقل کے خلاف ہے اُسی قدر تاریخ کے بھی مخالف ہے ۱۲

بگذر ازیں خانہ کہ جائے تو نیست	ویں رہ باریک بپائے تو نیست
کالبدے داری و جاں اندروست	ہرچہ تو دانی بہ ازاں اندروست
تا بود ایں سکہ بعالم درست	بر تن تو سکہ بود ایں نقشہ چست
تنوی اوراست ثنائے نکوے	بشنو ازیشاں اندازہ و ما ئے نگوے
ایں ہمہ ز انصاف گر بزور نیست	گر تو نہ بینی دگرے کور نیست

نظامی کی نسبت لیلیٰ مجنوں میں لکھتے ہیں۔

زندہ است بسینۂ اوستادم	ور نیست منش حیات دادم

غرض امیر صاحب نے کبھی اساتذہ کی اُستادی سے انکار نہیں کیا۔ وہ تمام اُستادوں کا نہایت ادب کرتے تھے۔ مطلع الانوار میں جو کہدیا ہے وہ ایک اتفاقیہ فخریہ جوش تھا جس سے نظامی کی تحقیر منظور نہ تھی۔

امیر صاحب کے حالاتِ شاعری میں یہ سب سے عجیب تر واقعہ ہے کہ وہ اپنے کلام پر آپ ریویو کرتے ہیں، اور ایسی بے لاگ رائے دیتے ہیں کہ انکا دشمن سے دشمن بھی ایسی آزاد رائے نہیں دے سکتا۔ قران السعدین میں اُنھوں نے کیقباد اور بغراخاں کا حال لکھا ہے، لیکن اصلی واقعہ کو چھوڑ کر خاص خاص چیزوں کی تعریف میں اس قدر مصروف ہو جاتے ہیں کہ واقعات کا سلسلہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے اور کلام نہایت بے ربط ہو جاتا ہے۔ اس عیب کو خود ظاہر کرتے ہیں۔

وصف بداں گونہ فرو راندہ ام	کہ غرضِ قصہ فرو ماندہ ام
عیب نہاں نیست کہ بنہفتہ ام	کانچہ بگوئید ہمہ گفتہ ام

چوں منم اندر قلبِ کان خویشں　　معترفِ عجز بہ نقصانِ خویشں

عیب یکے نیست کہ جو یند باز　　چوں ہمہ عیب است چگو یند باز

غرۃ الکمال کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ شاعر کی تین قسمیں ہیں، اُستادِ تمام، جو کسی طرزِ خاص کا موجد ہو، جیسے حکیم سنائی، انوری، ظہیر، نظامی، اُستادِ نیم تمام خود کسی طرزِ خاص کا موجد نہیں، لیکن کسی خاص طرز کا پیرو ہے اور اُسمیں کمال بہم پہنچایا ہے۔ سارق، جو اوروں کے مضامین چُراتا ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ اُستادی کی چار شرطیں ہیں، طرزِ خاص کا موجد ہو، اُسکا کلام شعراء کے انداز پر ہو صوفیوں اور واعظوں کے طریقہ پر نہ ہو، غلطیاں اور لغزشیں نہ کرتا ہو۔ یہ شرائط لکھکر فرماتے ہیں کہ میں درحقیقت اُستاد نہیں، اسلیے کہ چار شرطوں میں سے مجھ میں صرف دو شرطیں پائی جاتی ہیں، یعنی میں سرقہ نہیں کرتا، اور میرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے انداز پر نہیں، لیکن دو شرطیں مجھ میں موجود نہیں اول تو میں کسی طرزِ خاص کا موجد نہیں۔ دوسرے میرا کلام لغزشوں سے خالی نہیں ہوتا۔ خود اُنکے الفاظ یہ ہیں :-

بندہ را از اں چہار شرطِ اُستادی کہ گفتہ شد، اول شرطے کہ ملک طرز است بر حکم ما جرائے کہ در مجرائے قلم جریان یافت کہ چندیں اُستادِ را متابع کلمات بودہ ام،

چوں پس روِ طرزِ ہر سوادم　　پس شاگردم نہ اوستادم

و شرطِ دوم آنکہ در نافہ سواد بوے خطا نباشد از ان نیز دم نتوانم زد کہ نظم بندہ اگرچہ بیشتر روان است، اما جابجا در شغل و نقل لغزیدہ ...

ہم است دریں دو شرط معترفم کہ از لاف اُستادی قرعہ برفال توام غلط افتد

کیا دنیا میں اس سے زیادہ کوئی انصاف پرستی اور بے نفسی کی مثال مل سکتی ہے، امیر صاحب کے کلام پر ریویو کرنے کے لیے اس سے زیادہ بڑھکر کیا دلیل راہ ہو سکتا ہے۔

امیر صاحب نے بتا دیا ہے کہ وہ اصنافِ سخن میں سے کس صنف میں کس کے پیرو ہیں، تفصیل اسکی یہ ہے،

غزل، سعدی، مثنوی، نظامی
مواعظ و حکم، سنائی و خاقانی، قصائد، ضیاء الدین نیشاپوری کمال الدین اسمٰعیل خلاق المعانی

لیکن لغزشیں کون بتائے؟ یہ کس کا منہ ہے، ہم دبی زبان سے صرف اسقدر کہہ سکتے ہیں کہ بعض کلام میں (قران السعدین و اعجاز خسروی) لفظی رعایت بہت ہے جو ضلع جگت کی حد تک پہونچ گئی ہے، اور بعض جگہ بالکل تکلف اور آورد ہے۔

امیر صاحب نے شعر و شاعری کے متعلق دیوان کے دیباچہ میں بہت سے نکتے لکھے ہیں جن سے اس فن کے متعلق مفید نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔

غرۃ الکمال کے دیباچہ میں اسپر بحث کی ہے کہ فارسی اور عربی شاعری میں کسکو ترجیح ہے۔ فیصلہ فارسی کے حق میں کیا ہے، اور اسکی یہ دلیلیں لکھی ہیں،

(۱) عربی میں ایسے زحافات ہیں کہ اگر فارسی میں ہوں تو کلام ناموزوں ہو جائے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فارسی کے اوزان ایسے منضبط اور لطیف ہیں کہ ذرا سی کمی بیشی برداشت نہیں کر سکتے،

(۲) عربی زبان میں ایک ایک چیز کے لیے متعدد مرادف الفاظ ہیں اسلیے شاعری آسان ہے، ایک لفظ کسی وزن یا بحر میں نہ کھپ سکا تو دوسرا موجود ہے بخلاف اسکے فارسی میں نہایت محدود الفاظ ہیں۔ باوجود اسکے فارسی شعرا پر میدان شاعری تنگ نہیں۔

(۳) عربی زبان میں صرف قافیہ ہے ردیف نہیں۔

اب غور کرو عربی زبان کو متعدد طرح کی وسعت حاصل ہے۔ وزن اتنا وسیع کہ جتنے زحافات چاہیں استعمال کرتے جائیں۔ لفظوں کی یہ بہتات، کہ ایک لفظ کے بجائے دوسرا اور دوسرے کے بجائے تیسرا موجود ہے ردیف کی سرے سے ضرورت ہی نہیں، نرے قافیہ پر مدار ہے جسقدر قافیے ملتے جائیں کہتے جاؤ۔ اِن سب وسعتوں کے ساتھ۔ عربی شاعری فارسی شاعری پر غالب نہیں آسکتی۔

اسکے علاوہ عرب کا شاعر اگر ایران میں آئے اور برسوں قیام کرے تاہم فارسی زبان میں شعر نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایران کا شاعر بے تکلف عربی میں شاعری کرسکتا ہے زمخشری اور سیبویہ عجمی تھے لیکن زباندانی میں عرب عربا سے کم نہ تھے۔ فارسی کے وجوہ ترجیح لکھکر لکھتے ہیں کہ اور بہت سے وجوہ ہیں لیکن میں اسلیے قلم انداز کرتا ہوں کہ کوئی مذہبی تعصب کے پردہ میں مخالفت پر نہ آمادہ ہو جائے۔

امیر خسرو فن شاعری میں جن خصوصیات کے لحاظ سے ممتاز ہیں انکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) ایران میں جس قدر شعرا گذرے ہیں۔ خاص خاص اصناف شاعری

میں کمال رکھتے تھے، مثلاً فردوسی و نظامی مثنوی میں، انوری اور کمال قصائد میں سعدی اور حافظ غزل میں۔ یہی لوگ جب دوسری صنف میں ہات ڈالتے ہیں تو پھیکے پڑ جاتے ہیں، بخلاف اسکے امیر صاحب قصائد، مثنوی، اور غزل تینوں میں ایک درجہ رکھتے ہیں، مثنوی میں نظامی کے بعد آجتک انکا جواب نہیں ہوا غزل میں وہ سعدی کے دوش بدوش ہیں، قصائد میں انکی چنداں شہرت نہیں ہوئی، لیکن کلام موجود ہے، مقابلہ کرکے دیکھ لو، کمال اور ظہیر سے ایک قدم پیچھے نہیں، تفصیل اسکی آگے آتی ہے،

(۲) ایشیائی شاعری پر یہ عام اعتراض ہے کہ خاص خاص چیزوں پر نظمیں نہیں لکھی گئیں، مثلاً قلم، کاغذ، کشتی، دریا، شمع، صراحی، جامہ، خاص خاص میووں اور پھولوں وغیرہ وغیرہ پر ایسی مسلسل اور لمبی نظمیں نہیں ملتیں، جن سے انکی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ امیر صاحب نے ایشیائی شاعری کی اس کمی کو پورا کردیا ہے، اُنھوں نے قران السعدین میں اکثر اسی قسم کی نظمیں لکھی ہیں، اور اس کتاب سے اُن کا بڑا مقصد اسی قسم کی شاعری کا نمونہ قائم کرنا تھا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:-

بود در اندیشۂ من چند گاہ	کز دل دانندۂ حکمت پناہ
چند صفت گویم و آبش دہم	مجمع اوصاف خطابش دہم
طرز سخن را روشِ نو دہم	سکۂ آں ملک بہ خسرو دہم
سکۂ خود زیں فن اندیشہ زائے	تا نہ نشانم نہ نشینم زپائے
صفت نہ زاں گونہ شد از دل برون	کاں دگرے را بدل آید کہ چون

اس قسم کی شاعری کا نام امیر صاحب نے وصف نگاری رکھا، اور یہ نہایت موزوں نام ہے، اگرچہ افسوس ہے کہ زمانہ کے مذاق کے لحاظ سے اس میں نیچر کا پورا رنگ نہیں آیا، بلکہ تکلف اور مضمون آفرینی کا رنگ چڑھا یا ہے، تاہم جس قدر ہے غنیمت ہے۔

کاغذ کی تعریف

کاغذ[1] شامی نسب و صبح دام — آنکہ شد آئینۂ صبحش ز شام
سادہ حریرے وے اصلش ز خویش — با قصب خز شدہ پیوند خویش
تا سے حریر آمدہ اندر نورد — طرفہ حریرے کہ تو آں جز و کرد
آمدہ اجزائش فراہم ز آب[2] — لیک پراگندگیش ہم ز آب
بسکہ شد از کوبش بسیار پست — پشت دوتا گردد ش از پائے ست
گہ بود از دستۂ تیغش گذر — گہ دہد از تیغ بہ مقراض سر
گہ خلۂ سوزنِ مسطر کشد — گہ کششِ رشتۂ دفتر کشد
حرف بحرف از قلم آرد سخن — لیک بہ پیچید ہمہ بر خویشتن

بہت سے شعر لکھے ہیں، ہم نے قلم انداز کر دیے۔

کشتی کی تعریف

ساختہ از حکمتِ کار آگہاں — خانۂ گردندہ بہ گرد جہاں

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک کاغذ شام سے آتا تھا۔

[2] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے بھی اسی طرح کاغذ بناتے تھے کہ روئی اور کپڑے کے چیتھڑوں کو پانی میں بھگو کر پانی کی طرح سیال بنا لیتے تھے، پھر وہ خشک ہو کر کاغذ ہو جاتا تھا۔

نادرہ حکم خدا سے حکیم — خانہ رواں، خانگیانش مقیم
اہل سفر را ہمہ بروست گذر — ہمرہ او ساکن و او در سفر
جاریۂ ہند زبانش سلیم — حاملِ چندیں بچہ، لیکن عقیم
بیشتر از مرغ پرد، در کشاد — بیشتر از باد رود، روز باد
رفتہ دو منزل بدمے بل دوچند — بارسن و سلسلہ و تختہ بند
ہمچو کلنگاں بہوا سرفراز — پر چو حواصل زدہ سوکردہ باز
ہر طرفش رہ بشتاب دگر — ہر قدمش بر سرِ آبِ دگر
گرچہ بدریا گذرد بیش و کم — آب نباشد مگرش تا شکم
دست چو در آب فراز انگند — آب بدست آرد و باز افگند
لطمہ زدہ بر رخِ دریا بزور — آب ازاں لطمہ بفریاد و شور
در رہِ بے آب نداند شدن — کیست کہ بے آب تواند شدن؟

(۳۳) تشبیہ شاعری کے چہرہ کا غازہ ہے، لیکن تقلید پرستی نے یہ حالت پیدا کر دی تھی کہ جن چیزوں کی جو تشبیہیں ایک دفعہ قدماء کے قلم سے نکل گئیں اُنکے سوا گویا دنیا کی تمام چیزیں بیکار تھیں۔ امیر صاحب نے بہت سی نئی تشبیہیں خود پیدا کیں، چنانچہ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں:

تشبیہاتِ نو بسیار است ایں مجمل مجلد راتحمل نتواند کرد، اما دو سہ نظیر برائے یاد کردن گرد شدہ،

اسکے بعد دو تین مثالیں لکھی ہیں:

زانتظارِ دو ماہیِ ساقِ تو سد چشم — بزیرِ ہر موے دارم چو دامِ ماہی گیر

مژہ ہاے کُشر دل آویزت کُشر ہاست دو کانِ قصابت

زبہ خرامش آن نازنیں بعیاری کبوترے بہ نشاط آمدست پنداری

امیر صاحب چونکہ ہندی زبان سے آشنا تھے اسلیے تشبیہات میں اُنکو برج بھاکا کے سرمایہ سے بہت مدد ملی ہوگی۔ اخیر شعر غالباً اسی خرمن کی خوشہ چینی ہے۔ فارسی شعرا معشوق کی رفتار کو کبک کی رفتار سے تشبیہ دیتے تھے، ہندی میں ہنس کی چال عام تشبیہ ہے، لیکن کبوتر مستی کی حالت میں جس طرح چلتا ہے وہ مستانہ خرام کی سب سے اچھی تصویر ہے۔

قصیدہ، مثنوی، غزل میں اُنھوں نے جو جدتیں پیدا کیں اُنکی تفصیل علیحدہ علیحدہ عنوانوں میں آگے آتی ہے۔

مثنوی

مثنوی میں جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں، نظامی کے پیرو ہیں، نظامی کے پنج گنج میں تین قسم کی مثنویاں ہیں، رزمیہ، عشقیہ، صوفیانہ، امیر صاحب نے بھی تینوں مضامین کو لیا ہے اور ہر رنگ کو نظامی کے انداز میں لکھا ہے۔

ایک ایک مثنوی پر ریویو کرنا خاص اُنکے سوانح نگار کا کام ہے۔ البتہ نمایاں مثنویوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

قِران السعدین، یہ سب سے پہلی مثنوی ہے جو ۳۶ برس کی عمر میں لکھی اسلیے اسمیں تکلف اور آورد بہت ہے، لیکن باوجود اسکے اکثر جگہ نہایت لبند روان اور برجستہ ہے۔ مثنوی کا قصہ نہایت بیہودہ تھا، یعنی باپ بیٹوں کی مخالفت: خط و کتابت اور حملہ کی تیاری۔ بیٹا یعنی کیقباد نہایت گستاخ اور بے تمیز

تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہی صاحب تخت تھا اور اُسی کی فرمائش سے یہ مثنوی لکھی گئی، بیٹا یہ بھی چاہتا تھا کہ اُسکی گستاخیاں، جنکو وہ اپنی دلیری کے کارنامے سمجھتا تھا، مفصل اور آب ورنگ کے ساتھ لکھی جائیں، اور یہ ثابت کیا جائے کہ باپ کے ہوتے، تخت سلطنت کا مستحق بیٹا ہے۔ اس چھوٹی منطق کو امیر صاحب نے جہاں تک ہو سکا، خوب نباہا ہے، چنانچہ بیٹے کی زبان سے کہتے ہیں۔

گر بہ گہر تاج ستانِ توام	عیب مکن گوہر کانِ توام
ور ہوس تاج ترا در سراست	من گہرم تاج مرا در خوراست
چوں سرم از تخت سرافراز گشت	تاجِ تو بر تارکِ من باز گشت
تخت جہاں بہر تو برپاے کرد	لیک بدان تخت مرا جاے کرد
ملک بمیراث نیابد کسے	تا نزند تیغ دو دستی بسے
از تو اگر نامِ پدر روشن است	خطبہ جدا بیں کہ بنامِ من است
ہر دو جوانیم من و بخت من	با دو جواں پنجہ ہم در مزن
گرچہ بروئے تو نکشم در ستیز	از پئے تعظیم تو شمشیر تیز
لیک تو دانی کہ چو کیں آورم	شیر فلک را بہ زمیں آورم
جز تو کسے گردم ازیں در زدے	سرزنشِ تیغ منش سر زدے
لیک توئی چوں بہ بیچے ایں سریر	من ندہم گر تو توانی بگیر

باپ نے جو جواب لکھا ہے دیکھو کس طرح، حرف حرف، پدرانہ محبت کے نشہ سے چور ہے

اے ز نسب گشتہ سزائے سریر	وز پسری ہیچ پدر بے نظیر
گرچہ غبارہ است ز کارِ توام	سرمۂ چشم است غبارِ توام

تا تو نہ دانی کہ دریں گفتگوے — از پئے ملک است مرا گفتگوے
گرچہ توانم ز تو ایں پایہ برد — از تو ستانم بکہ خواہم سپرد
شکر کہ شد زندہ در ایام تو — من ز تو و نام من از نام تو
باش بہ کامم کہ بکام تو ام — زندہ و نازندہ بنام تو ام
خواہمت از جاں کہ بناہی مرا — ور تو بخواہی دنخواہی مرا
جز بہ تمناے تو سوداء نیست — بہتر ازیں ہیچ تمنا م نیست
گرچہ کہ سلطانِ جہانم بہ ملک — تاج دہ و تخت ستانم بہ ملک
لیک چو دورم ز تو اے نیکبخت — نے خوشم از تاج و نہ شادم ز تخت
بختِ من از پایہ بر افلاک سود — با تو چو یکدم ننشینم چہ سود

ان خاکساراں الفاظ نے بیٹے کے دل پر بھی اثر کیا، اب اسکا لہجہ بدل جاتا ہے اور فرزندانہ جوشِ محبت میں کہتا ہے:

من کہ گلے رستۂ باغِ تو ام — پرتوے از نورِ چراغ تو ام
گر ہمہ بر ماہ رسد افسرم — ہم بہ تہ پاے تو باشد سرم
زاید خود کن تو اشارت بمیں — من سر خاقان فگنم بر زمیں
تاج ز من سرز تو افراختن — تاج ز تو، تخت ز من ساختن
ور بہ ملاقات رہی برائے تست — افسر من خدمتی پائے تست
نیست مرا آں محل و آں شکوہ — کز سر خود سایہ فشانم بہ کوہ

باپ جب بیٹے سے ملنے آیا ہے تو بیٹا تخت شاہی پر متمکن تھا، باپ کو دیکھ بے تحاشا تخت سے اترا اور باپ کی طرف بڑھا، باپ نے چھاتی سے لگا لیا، دیر تک

دونوں جوش محبت میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے، پھر بیٹے نے باپ کو لیجا کر تخت پر بٹھایا،

گرم فرو جست ز تختِ بلند کرد بہ آغوشِ تنِ ارجمند

داشت بہ آغوش خودش تا بدیر سیر نہ شد چوں شود از عمر سیر

باخودش از فرش باورنگ بُرد تختِ کیاں باز کیاں را سپرد

گاہ زدیدہ بہ ثنایش گرفت گاہ دوبارہ بہ کنارش گرفت

گاہ نظر بر رخِ زیباش کرد گاہ دل از مہر شکیباش کرد

پرسش از اندازہ زغایت گذشت حدِ نوازش زعنایت گذشت

قران السعدین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نظم اور لطائف نظم کی پابندی کے ساتھ تاریخی حیثیتیں تمام ملحوظ رکھی گئی ہیں، اس طرح کہ کوئی نثر لکھتا تو اس سے بڑھکر ان باتوں کو نہ لکھتا۔

خمسہ خمسہ میں پانچ مثنویاں ہیں یعنی مطلع الانوار، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں، آئینۂ اسکندری، ہشت بہشت،

جس ترتیب سے ہم نے ان کتابوں کے نام لکھے ہیں، یہی اُنکی تصنیف کی ترتیب ہے، چنانچہ امیر صاحب نے خود ہشت بہشت میں تصریح کی ہے، ان پانچوں کتابوں کی تصنیف کا زمانہ کُل سوا دو برس ہے، اور یہ قادرالکلامی اور پُرگوئی کا حیرت انگیز اعجاز ہے۔

اگرچہ اس میں شبہہ نہیں کہ نظامی کے جواب میں جس قدر خمسے لکھے گئے اُن کی نسبتًہ امیر صاحب کا خمسہ سب سے بہتر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے

کہ ان میں بعض نظامی کی تصنیف سے کچھ نسبت نہیں رکھتیں۔ مطلع الانوار میں صاف خامی نظر آتی ہے اور آئینۂ اسکندری بالکل پھیکی اور کمزور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود امیر صاحب کے دل میں بھی بے اطمینانی تھی۔ آئینۂ اسکندری میں لکھتے ہیں۔

وگر بازگیری تو پیوند خویش | مرا خود عزیز است فرزند خویش
سزد گرچہ آواز خر، خندہ را | بود ارغنوں گوش خر بندہ را
بود باد تحسین و داد گر | کہ بر من بہ بخشش گمارد نظر
ہنر جوے ودر عیب جوئی مکوش | ترا نیز عیبے است بر خود بپوش

نظامی کے پرزور رزمیہ معرکوں کے مقابلہ میں انکے زور طبع کا یہ نمونہ ہے۔

بگردوں شد از نامے زریں خروش | بدریاے لشکر درافتاد جوش
ہزاہز درآمد بہر دو سپاہ | زدارو درآمد بخورشید و ماہ
علم سر ز عیوق بر تر کشید | سناں چشم سیارہ بر سر کشید
بیاباں ہمہ بیشۂ شیر گشت | جہانے پُر از شیر و شمشیر گشت
غبار زمیں کاہ بر ماہ بست | نفس راہ درون گلو راہ بست
جہاں گشت روے ہوا گرد ناک | کہ سیارہ گم کرد خود را بخاک
سیاہ از زرہ موج زن تا باوج | چو دریا کہ بادش درآرد بموج
بدریاے آہن جہاں گشتہ غرق | ہوا پُر ز تیغ و زمیں پُر ز برق
زبانگ ہیوہان گیتی نزد | شدہ پُر صدا گنبد لاجورد
عرق کردن توسناں در شتاب | ز دریاے آتش بر انگیخت آب

شرارہ کز زد نعل ہنگام رد | ستارہ بروں ریخت از ماہِ نو
نفیر زواز چاشنی کماں | شدہ چاشنی بخش جاں ہر زماں
گرہ بر گرہ دشت پیکاں زناں | زرہ بر زرہ بشت روئین تناں
بزیر سپر تیغ رخشاں زتاب | چناں کز تہِ برگ نیلوفر آب

اس کمی کے مختلف اسباب ہیں، مثنوی امیر صاحب کا اصلی مذاق نہیں، سلاطین کی فرمایش سے وہ مثنویاں لکھتے تھے اور گویا بیگار ٹالتے تھے، چنانچہ خمسہ کا خمسہ دو سوا دو برس میں لکھا ہے اور مطلع الانوار تو صرف دو ہفتہ کی کمائی ہے۔

ان کتابوں کی تصنیف کے زمانہ میں دربار کی خدمتوں سے بہت کم فرصت ملتی تھی۔ لیلیٰ مجنوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں کہ نظامی کو شاعری کے سوا کوئی شغل نہ تھا اور کسی قسم کی بے اطمینانی نہ تھی، میرا یہ حال ہے کہ پاؤں کا پسینہ سر پر چڑھتا ہے تب روٹی ملتی ہے۔

سکین من مستمند بیہوش | از سوختگی چو دیگ در جوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام | در گوشۂ غم نگیرم آرام
با شم زبرائے نفس خود رائے | پیشِ چو خودے ستادہ بر پائے
تا خوں نہ رود ز پائے تا سر | دستم نہ شود ز آب کس تر

اس خمسہ میں ایک کتاب انکے خاص مذاق کی ہے، یعنی لیلیٰ مجنوں اگرچہ اس کتاب میں بھی اُنھوں نے خاکساری سے نظامی کے سامنے اپنے آپ کو ہیچ کہا ہے۔

میداد چو نظم نامہ را پیچ | باقی بگذاشتہ بہر ما ہیچ

لیکن انصاف یہ ہے کہ انکی لیلےٰ مجنوں اور نظامی کی لیلےٰ مجنوں میں اگر کچھ

فرق ہے تو اس قدر نازک ہے کہ خود وہی اُسکو سمجھ سکتے ہیں۔

اس کتاب میں ہر قسم کی شاعری کے موقع پیدا کیے ہیں، اور اُنکا کمال دکھایا ہے۔ مثلاً ایک موقع پر دھوپ کی شدت اور گرمی کا سماں دکھاتے ہیں۔

آتش زدہ گشتہ کوہ و کاں ہم — تفتیدہ زمین و آسماں ہم
جائے نہ کہ دیدہ را برد خواب — ابرے نہ کہ تشنہ را دہد آب
مرغان چمن خزیدہ در شاخ — در رفتہ چرندگاں بہ سوراخ
ریگ از تفِ پختہ در گرانی — چوں تابۂ روغن سپاہانی
از گرمیِ ریگہائے گرداں — پُر آبلہ پائے رہ نورداں

عشق و محبت کے جذبات کے دکھانے کا اس سے بڑھکر کونسا موقع مل سکتا تھا اس لحاظ سے اس مثنوی کا ہر شعر گویا ایک پُر درد غزل ہے۔ سگ لیلیٰ کا واقعہ عموماً مشہور ہے اور شعرا نے اس دلچسپ روایت کو طرح طرح سے رنگا ہے۔ امیر حسن نے اسکو سب سے زیادہ موثر طریقہ سے ادا کیا ہے۔ مجنوں کُتّے سے خطاب کرتا ہے

ہستیم من و تو ہر دو شب گرد — لیکن تو بہ نالۂ من از درد
چوں باز گذر کنی دراں کوے — بر خاک درش زمن نہی روے
ہر خس کہ بر و گذاشت گامے — از من برسانیش سلامے
ہر جا کہ نہاد پاے روشن — زنہار ببوسی از لب من
خواہد چو ترا درون دہلیز — یادش دہی از سگِ دگر نیز
زنجیر خودت نہد چو بر دوش — از گردن من مکن فراموش

اس پیرایۂ ادا کو دیکھو۔ کہتے ہیں کہ جب لیلیٰ تجھکو ڈیوڑھی کے اندر بلائے تو

ایک اور سگِ در کو یاد دلا دینا، جب لیلیٰ تیری گردن میں طوق ڈالے تو دیکھنا میری گردن کو بھول نہ جانا۔

عاشق کا پیام سلام سب لکھتے ہیں، لیکن معشوق عاشق کو کیا لکھتا ہے، نہایت نازک مقام ہے۔ دیکھو امیر صاحب اس نازک موقع کو کیونکر نباہتے ہیں، لیلےٰ مجنوں کو لکھتی ہے :-

اے عاشق دور ماندہ چونی	وے شمع ز نور ماندہ چونی
روزت دانم کہ شب نشان است	شبہاے سیاہ بر چہ سان است
از من بکہ بری حکایت	با خود زکہ می کنی شکایت
در گوشش کہ؟ نالہ می رسانی	دریاے کہ؟ قطرہ می فشانی
بازارِ تو در کدام سوی است	سیلابِ تو در کدام جوی است

معشوق اس قدر ضرور جانتا ہے کہ عاشق رونے دھونے اور دردِ دل کہنے سے باز نہیں رہ سکتا اب اُسکی غیرت یہ سوالات پیدا کرتی ہے کہ کس کے سامنے روتا ہے؟ کس سے دردِ دل بیان کرتا ہے؟ کس کے آگے میرا نام لیتا ہے، یہ باتیں تو راز داری اور معشوق پرستی کے خلاف ہیں، ان سچے جذبات اور خیالات کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

آئینہ اسکندری پھیکی ہے لیکن اس کتاب میں بھی انکے مذاق کا جو سیدان آیا ہے اُس میں وہ نظامی کے دوش بدوش ہیں، نظامی نے سکندر اور بُتِ چینی کی بزم آرائی کا قصہ بڑی آب و تاب سے لکھا ہے، خاص اُس موقع پر خوب زورِ طبع دکھایا ہے جہاں وہ دلربا سکندر کی ایک ایک بات پر اپنی ترجیح ثابت کرتی ہے

امیر صاحب نے بھی یہ معرکہ باندھا ہے اور اسی طرح بُتِ چینی کا فخریہ لکھا ہے۔ نظامی کے فخریہ سے ملا کر دیکھو، معشوق چینی کہتا ہے اور سکندر کے ایک ایک وصف کے مقابلہ میں اپنی ترجیح ثابت کرتا ہے،

مشعبد کہ داند جہاں سوختن | ز من بایدش بازی آموختن
ہمہ خون خوبان کشش می خورم | وے نوش بادم کہ خوش می خورم
رخِ ہر صنم ناپدید از من است | صنم خانہ ہا را کلید از من است
سپہر آفتابِ زمیں خواندم | وگر ماہ بینید ہمیں خواندم
سکندر کہ گرد آبِ حیواں ہوس | نظیر منش بود مقصود و بس
گر او ہست کیخسرو و جام جوے | مرا جام گیتی نمائے ہست روے
گر از مجلسِ او سمن مے دمد | مرا لالہ و گل ز تن مے دمد
گر او راست بر تخت پائے نشست | مرا در دل اوست جائے نشست
گر او تاج خواہد ز شاہاں خراج | من از سروراں سرستانم نہ تاج
گر اقبال و دولت ورا یاور اند | مرا ہر دو چوں کمتریں چاکر اند
گر او دشمناں را بجوں خوردن است | مرا خون صد دوست بر گردن است
گر او را یکے آئینہ بر کف نشست | دو آئینہ دارم من از پشتِ دست
کمانِ وے از صید شکار افگند | کماں ابروے من صد مرد افگند
کمند وے از صید بند و دام | من آنم کہ صیاد گیرم بدام
گر او را کلاہ ہست بر آسماں | مرا صد کلاہ ہست بر آستاں

ہشت بہشت یہ سب سے اخیر مثنوی ہے اور امیر صاحب کی بالاتر

انتہائی پختگی اور پرکاری کی اخیر حد تک پہنچ گئی ہے، خاص جو بات اس میں ہے وہ واقعہ نگاری کا کمال ہے، ساری کتاب میں فرضی حکایتیں لکھی ہیں، لیکن یہ التزام کیا ہے کہ جو واقعہ لکھا بائے اُسکے نہایت چھوٹے چھوٹے جزئیات جن کے ادا کرنے سے زبان قاصر ہو جاتی ہے، ادا کیے بائیں،

تمام کتاب کا یہی انداز ہے اور اس خصوصیت کے لحاظ سے فارسی زبان کی کوئی مثنوی اسکا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

مثلاً ایک قصہ لکھا ہے کہ حسن ایک سنار تھا، اُسکو بادشاہ نے ایک جرم کی بنا پر یہ سزا دی کہ ایک اونچی لاٹ پر چڑھوا دیا، حسن کی بیوی لاٹ کے پاس گئی، حسن نے لاٹ پر سے کہا کہ بازار سے ریشم اور قند لا۔ جب وہ لائی تو کہا کہ ریشم کے تار کے سرے پر قند چپکا کر کسی چیونٹی کے مُنہ میں جو لاٹ پر چڑھ رہی ہو دیدے، اور خود جلد جلد تار کی گولی کھولتی جائے، چیونٹی تار کو لیے ہوے اوپر چڑھتی چلی گئی، حسن کے قریب پہنچی تو حسن نے تار کو لیکر اُس سے رسی بٹی، اور پھر ایک خاص تدبیر سے اُسی کے سہارے نیچے اُترا، تمام قصہ بہت لمبا ہے البتہ اسکے چند شعر ہم نقل کرتے ہیں،

چوں نگہ کرد خواجہ از بالا	کہ زنش در رسید با کالا
داد ش آواز گفت بر سرِ تار	پارۂ قند کن بزودی یار
دہ بمورے کہ می رود بر میل	تا ببالاش می رود تعجیل
رشتہ را زود زود می کن باز (لات)	کز نشیب آید او بسوے فراز
ہمچناں کرد زن کہ او فرمود	داد رشتہ بمور و مور ربود

رانده بالائے میل تار کشاں | رسن فتنه بر حصار کشاں
چوں به نزدیک خنه رفت به زور | ریسماں را ربود خواجه زدود

قصائد قصیدہ میں انکا کوئی خاص انداز نہیں ہے۔ کمال اسمعیل، خاقانی، اور انوری کی تقلید کرتے ہیں، اور جسکے جواب میں قصیدہ کہتے ہیں اسکا تتبع کرتے ہیں، خاقانی کا مشہور قصیدہ ہے،

مجلس دو آتش داده، بایں از شجر وں از حجر | ایں کرد منقل را مقروان جام را جا داشته

اسکے جواب میں بہت بڑا قصیدہ لکھا ہے، وہی انداز، وہی ترکیبیں وہی استعارے ہیں، اور چونکہ خاقانی کا مقابلہ ہے، اسلیے ۱۰۷ شعر کہکر دم لیا ہے۔ اس میں بھی واقعہ نگاری کا خاص انداز قائم ہے۔ عید کا بیان کیا ہے اور عید کا پورا سماں دکھایا ہے،

هر سو جواناں نو سلب، هر سو عروساں در قصب | طفلاں نه خفته از طرب دیده به فردا داشته
از شیر و خرما مرد و زن، در شیرخواری تن به تن | چوں شیرخواراں در دهن پستان خرما داشته
خورشید چوں سر بر زده، هر کس به بالے در شده | ایں رو به سوئے میکده، او در مصلا داشته
فاسق کرسنه ناخورده گه، در عیدگه بیهوده ره | سر بر بساط سجده گه دل سوئے صهبا داشته
دارے معلول است مے، بل جان مخلول است مے | خورشید منخول است مے، در طاس مینا داشته

انکے قصائد میں مدحیہ مضامین ہمیشہ بدمزہ اور پھیکے ہوتے ہیں، جسکی وجہ یہ ہے کہ مدح دل سے اُنکو پسند نہیں، صرف معاش کی ضرورت سے یہ ذلت گوارا کرتے ہیں، اس لیے قصیدہ میں اور اور مضامین کو لیتے ہیں اور اُن میں زور طبع دکھاتے ہیں، مثلاً بہار کا سماں، برسات کی رُت، صبح و شام کی کیفیت ۔ یک

قصیدہ میں برسات کے آغاز سے تمہید شروع کی ہے اور صرف مطلع میں سبب کچھ کہدیا ہے

ابر بارید و ہمہ روے زمیں را تر کرد   خبر آرید کہ سبزہ چہ قدر سر بر کرد

سپیدہ دم کہ صبا گشت بوستاں فرسو   بساطِ خاک ز دیباو پرنیاں فرمود
چو روے نازکِ گل تابِ آفتاب نداشت   زمانہ بر سرش از ابر سایہ باں فرمود
ز لالہ خواست چمن ساغرو بیک بخشید   ز ابر خواست زمیں شربتِ روانؔ فرمود
ہر آنچہ در ورقِ خویش غنچہ فصل داشت   بنفشہ گوش نہاد و صبا بیاں فرمود

صبح کا سماں

سپیدہ دم کہ فلک روشنی بہ گیہاں داد   نسیم غالیہ در دامن گلستاں داد
چو چرخ پیر بہ رخ زد سپیدی و سرخی   بدستش آئینہ داد آفتاب خنداں داد
درست مغربی آفتاب را کہ فلک   نہاد زیرِ زمیں بامداد تاباں داد
ستارہ را ز چہ شد دیدہ خیرہ از خورشید   چو شب ز حقہ مینا قرص سر مہ جنباں داد
غلام بادِ صبا ام کہ بامداد و پگاہ   صلاے عیش بہ عشرت سراے مستاں داد

باغ

نو بہار است و چمن جلوہ چو حورا کردہ   ابر ہا ریختنی لولوِ لالا کردہ
گرہِ طرۂ سنبل کہ صبا باز شدہ   دامن لالہ پر از عنبر سارا کردہ
بر گل و لالہ سیر و د آنگہ قمری   پاے آلودہ بخوں تا بچہ بالا کردہ
عاشقاں رفتہ بگلزار و دل سوختہ را   بہ تکلف ز گل و لالہ تسکیں کردہ

لے رواں فرمود، فوراً حاضر کرنا۔

نوبہار اسال مارا روزہ فرماید ہمی ‏ گل چناں تر دامن از مے لب نیالاید ہمی
بردہان غنچہ گہ گہ می زند بوسہ نسیم ‏ کاں شکر لب جز بہ بوسہ روزہ نکشاید ہمی
باد در کہسار جام لالہ را برنگ زد ‏ گل بخندہ گفت تقوے ایں چنیں باید ہمی
نرگس رعنا قدح بردست و چشم اندر ہوا ‏ گوئیا سیخوارہ ماہ عید را پاید ہمی
(گویا شراب خوار ماہ عید کو ڈھونڈھتا ہے)

برسات

ہوائے خرم است و ہر طرف باراں ہمی بارد ‏ تگویم قطرہ کز بالائے گل ریحاں ہمی بارد
نگوں سر شاخہائے سبز گوئی دُر ہمی چیند ‏ ز بس کا بر زر افشاں لولوی غلطاں ہمی بارد
یعنی شاخیں جو جھکی ہوئی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل نے جو زمین پر موتی برسائے ہیں یہ اُنکے رولنے کو جھکی ہیں -
چکاں قطرہ ز سرہائے انار تر تو پنداری ‏ کہ ہر دانہ کہ بود و است اندروں نیاں ہمی بارد
خوش آں وقتے کہ مطرب در سماع نیکواں سرخوش ‏ خراماں در میان سبزہ و باراں ہمی بارد

بعض قصائد سرتاپا موعظت و اخلاق میں ہیں، ان میں بحر الابرار جو بڑا اسیر حاصل قصیدہ ہے مشہور ہے، التزام کیا ہے کہ ہر شعر میں دعویٰ اور اُسکے ساتھ دلیل ہو،

کوس شہ خالی و بانگ غلغلش در دِسر است ‏ ہر کہ قانع شد بہ خشک و تر شہ بحر و بر است
عاشقی رنج است و مرداں را بسینہ راحت است ‏ سلسلہ بند است شیراں را بگردن زیور است

یعنی عاشقی میں گو تکلیف ہے، لیکن مردوں کو وہی آرام دہ ہے، جس طرح شیر زنجیر میں بندھا ہوتا ہے اور یہی زنجیر اُسکا زیور ہے،

مرد نہاں در گلیمے بادشاہ عالم است ‏ تیغ خفتہ در نیامے پاسبان کشور است

راهرو چوں دریا کو شد مرد شهوت است ‏ ‏ ‏ بیوه زناں چوں مرغ بیا باید به بند شوهر است
نفس خاک تست هرگه نور بالا بر تو تافت ‏ ‏ ‏ سایه زیر پا شود هرگه که بر تارک خور است
کار اینجا کن که تشویش است در محشر بسے ‏ ‏ ‏ آب زینجا بر که در دریا بسے شور و شر است
ناکس و کس هر که حرص مال دارد دوزخی است ‏ ‏ ‏ عود و سرگیں هر چه در آتش فتد خاکستر است
اے برادر مادر دهر ار خورد خونت مرنج ‏ ‏ ‏ چوں ترا خون برادر به ز شیر مادر است
دهر خاکے را نمونه میکند کیں مردم است ‏ ‏ ‏ بحر آبے را غلوله میکند کیں گوهر است

اہل سخن کے نزدیک قصیدہ میں شاعر کی جدت طبع کا اندازہ مخلص یعنی گریز سے ہوتا ہے۔ اس معیار کے لحاظ سے امیر خسرو اپنے تمام ہمعصروں سے ممتاز نظر آتے ہیں، انکے مخالص کی چند مثالیں ذیل میں ہیں،

برسات کے ذکر کے بعد

برآمد ابر در بخشش گرزاں پایه در غلطد ‏ ‏ ‏ نگیرد هیچکس دستش گر شاه جهاں گیرد

بہار کی تمہید کے بعد

گل ار کنم عمرش گو باش دائی ‏ ‏ ‏ که در خور کیست عمر جاوداں را
نهال باغ شاهی رکن حق آنکه ‏ ‏ ‏ ز بزم اوست رونق بوستاں را

کشاده چهره که ماهے شدم برشتے نیں ‏ ‏ ‏ در ملک بنمودم که آسماں این است

طلوع صبح کا بیان کرکے

صبح را گفتم که خورشید کجا است ‏ ‏ ‏ آسماں روے ملک جهجو نمود

ندارد روے آں نازک گرباہیچ پیسے | گرد سایۂ رایاتِ شاہِ کامگار آمد

طلوع آفتاب کے بعد

خورشید جہانگیر بپندارکہ در بزم | شمشیر کشیدہ ملک الشرق برآمد

قصائد میں امیر صاحب نے جس قدر جدید مضامین، لطیف استعارات، نئی نئی تشبیہیں، گوناگوں اسباب پیدا کیے اُسکا احاطہ نہیں ہو سکتا، ہم اس موقع پر صرف بہاریہ تمہید کے چند شعر اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں کہ بہار شعرا کا پامال میدان ہے لیکن امیر صاحب اس میں بھی سب سے الگ ہیں۔

بوستاں شگفت روے لالہ خنداں گشت باز | بر رخِ گل طرۂ سنبل پریشاں گشت باز

سبزہ خطے چند بہرِ خواندن بلبل نوشت | بلبل آنگہ از خطِ خوباں غزلخواں گشت باز

خون لالہ گوئ[illegible] اخواہد چکید از تیغ کوہ | یا چکید آں خوں کہ کوہ آلودہ داماں گشت باز

غزل

اوپر پڑھ آئے ہو کہ غزل قدما کے زمانہ تک کوئی مستقل چیز نہ تھی، سعدی نے غزل کو غزل بنا دیا۔ امیر خسرو کی غزل گوئی پر تقریظ کرنی ہو تو صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہی خمخانہ سعدی کی شراب ہے جو دوبارہ کھنچکر تیز ہو گئی ہے۔

غزل کی جان کیا ہے؟ درد، سوز و گداز، جذبات، معاملاتِ عشق و نیاز۔ اسکے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ یہ جذبات اور معاملات جس زبان میں ادا کیے جائیں، وہی زبان ہو جسمیں عاشق، معشوق سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے یعنی سادہ ہو، بے تکلف ہو، نرم ہو، لطیف ہو، نیاز آمیز ہو۔ اسکے لیے یہ بھی ضرور ہے کہ چھوٹی چھوٹی بحریں ہوں، جملوں کی ترکیبوں میں نام کو بھی الجھاؤ نہ ہو،

قریب الفہم خیالات ہوں، اس حد تک امیر صاحب شیخ سعدی کے دوش بدوش ہیں، لیکن وہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں، اُنھوں نے غزل کی اصلیت کے علاوہ کمال شاعری کی بہت سی چیزیں اضافہ کیں اور ایجادات اور اختراعات کے چمن کھلا دیے، یہ سب جمال تھا تفصیل ذیل یہ ہے۔

بحروں کی موزونی — وہ اکثر شگفتہ اور چھوٹی چھوٹی بحریں اختیار کرتے ہیں جنھیں خواہ مخواہ بات کو صفائی، سادگی، اور اختصار سے ادا کرنا پڑتا ہے، مثلاً

سرے دارم کہ سامان نیست اورا — بہ دل دردے کہ درمان نیست اورا
فراموش کرد عمرم روز راز آنکہ — شبے دارم کہ پایان نیست اورا
ز راہِ انتظارم ہست چشمے — کہ خوابے ہم پریشان نیست اورا

یارِ من دل ز دوستاں برداشت — مہر دیرینہ از میاں برداشت
دردِ دل او نہ کرد کار ارچہ — تنگ از نالہ ام فغاں برداشت
وی بہ تندی بلند کرد ابرو — از پئے کشتنم کماں برداشت

آں دوست کہ بود دیر کراں شد — واں صبر کہ داشتم نہاں شد
گفتم کہ اسیر گردی اے دل — دیدی کہ بعاقبت ہماں شد
دل بر دگرے نہم ولیکن — عاشق بہ ستم نمی تواں شد

عاشقے را چو نامہ باز کنید — نامِ من بر سرش طراز کنید

گر شما دینِ عاشقاں دارید ۔۔۔ بعد ازیں پیشِ بُت نماز کنید
گاہ مُردن شنیدہ ام محمود ۔۔۔ گفت رویم سوے ایاز کنید

دادمن آں بتِ طراز نداد ۔۔۔ پاسخے نیز دلنواز نداد
خواب مارا بہ بست و باز نکرد ۔۔۔ دل مارا ببرد و باز نداد
تو چہ دانی نیاز مندی چیست ۔۔۔ چوں خدایت بکس نیاز نداد

سوز و گداز سوز و گداز کے خیالات جب وہ ادا کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آگ سے دھواں اُٹھ رہا ہے، اس میں بھی معشوق سے اپنا حال کہ رہے ہیں - کبھی اپنی تصویر کھینچتے ہیں کبھی خود اپنے آپ پر انکو رحم آتا ہے،

ماجرائے دوست پُرسیدی کہ چوں بگذشت حال ۔۔۔ اے سرت گردم، چہ میپرسی بدشواری گذشت

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عاشق، معشوق سے اپنی سرگذشت جب بیان کرتا ہے تو تھوڑا سا کہکر اُسکو رونا آتا ہے، ٹھیر جاتا ہے، رو لیتا ہے، پھر آگے بڑھتا ہے اسکی تصویر کھینچتے ہیں،

خسرو است و شب فسانہ دیار دھر بار ۔۔۔ قدرے گریدو بیں بر سرا فسانہ رود

زانوش خسرو بزیر سر نیافت ۔۔۔ سر نہادہ بر سرِ زانو بخفت

اے آشنا کہ گریہ کناں پندمیدہی ۔۔۔ آب از بروں مریز کہ آتش بجاں گرفت
کبھی کبھی عاشق کا دل کہتا ہے کہ صبر سے کام لینا چاہیے، پھر دل پر غصہ

آتا ہے اور کہتا ہے کہ کمبخت جو بات نہیں ہوسکتی اُسکے کہنے سے کیا فائدہ۔ اس معاملہ کو یوں باندھتے ہیں،

غصہ ام می کشد اے دل سخن صبر مگوے   وہ چرا گوئی ازاں کار کہ نتوانی کرد

حسد می بردی اے دشمن! بعقل و دانش خسرو   بیا تا بمرادِ خاطر خود بینی اکنونش

رنج و غم کی اس سے بڑھ کر عبرت انگیز تصویر نہیں کھینچی جا سکتی، عاشق جس کا فضل و کمال اور عقل اور سمجھ عموماً مسلّم ہے۔ عاشق ہوکر تمام فضل و کمال اور عقل کھو چکا ہے، وہ اپنی حالت پر نظر ڈالتا ہے تو خیال آتا ہے کہ دشمنوں کی امید بر آئی، اسکو کس موثر طریقے سے ادا کیا ہے،

نماں ز تن بردی و در جانی ہنوز   دردہا دادی و درمانی ہنوز

گفتی اندر خواب گہ گہ روے خود بنمایمت   ایں سخن بیگانہ را گو، کاشنا را خواب نیست

غمزۂ تو بر دل سلطاں زند   ورنہ رنجی بر دل درویش ہم

یعنی تیرا غمزہ بادشاہوں کے دل پر حملہ کرتا ہے، اور برا نہ مان تو فقیروں پر بھی، "ورنہ رنجی" سے کس قدر عاشقانہ خضوع ظاہر ہوتا ہے۔

کشتم از تیغِ جفایش خویش را   بر تو آساں کردم و بر خویش ہم

من کجا خُسپم کہ از فریادِ من   شب نمی خُسپد کسے در کوے تو

صبر طلب می کنند از دل عاشق — ہمچو خراجے کہ بر خراب نویسند

یعنی معشوق، عاشق کے دل سے صبر چاہتے ہیں، یہ ایسی بات ہے کہ بنجر زمین پر محصول لگایا جائے،

اے دیدہ چہ ریزی از بروں آب — کیں شعلہ بجاں گرفت ما را

اے خواب! برو کہ باز امشب — سودائے فلاں گرفت ما را

اے عشق کار تو بہ چو من تا کسے فتاد — گویا کسے نماند جہانِ خراب را

دل ندارم غم جاناں بچہ تدبیر خورد — پیش ازیں گرچہ غمے بود دلے ہم بودہ است

کس چہ داند کہ چہ رفت از غم تو دوش بمن — از شب تیرہ، خبر پرس کہ محرم بودہ است

بیا بر دوستاں جاناں تفضل کن — ہر آں تیرے کہ بر دشمن خطا شد

دل باز سوئے آں بت بدخو چہ میرود — آں خو گرفتہ باز دراں کوچہ میرود

جاں میرود ز تن چو گرہ میزند بزلف — مردن مراست از گرہ او چہ میرود

گر نہ بینی دل ویرانِ مرا — گویا ہیچ گہ آباد نبود

کافرے زخت دلم غارت کرد — شہر اسلام و مرا داد نبود
بہ نقصان نہ پہنچ گیا۔

کرشمہ چند کنی برمن آخر ایں جان است　　نمی دمد ز زمین و صبا نمی آرد

اس مضمون پر تین سو برس کے بعد اہلی نے یوں دست درازی کی،

کرشمہ چند کنی برمن آخر ایں جان است　　نمی دمد ز زمیں آسماں نمی دارد

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم　　پس ازانکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

جدتِ اسلوب غزل کی ترقی کا نور وز، لطفِ ادا، اور جدتِ اسلوب ہے جسکے موجد شیخ سعدی ہیں، لیکن پھر وہ نقش اولیں تھا۔ امیر صاحب کی بوقلموں طبیعت نے جدتِ اسلوب کے سیکڑوں نئے نئے پیرائے پیدا کر دیے، جو گلوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے تھے۔ مثلاً یہ مضمون کہ معشوق ظلم و ستم کے ساتھ بھی محبوب ہے، یوں ادا کرتے ہیں

جاں ز تن بُردی و در جانی ہنوز　　دردہا دادی و درمانی ہنوز

یا مثلاً معشوق کی گراں قدری کو اس پیرایہ میں ادا کرتے ہیں۔

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتۂ　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

معشوق کی آنکھ کو سب مخمور اور مے آلود باندھتے تھے، اسی مضمون کو دیکھو امیر صاحب نے کس انداز سے کہا ہے

مے حاجت نیست مستیم را　　در چشمِ تو تا خمار باشد

معشوق کا عاشقوں کے رنج و غم سے بیخبر ہونا، عام مضمون ہے اسکو کس لطف سے ادا کیا ہے۔

گل چہ داند کہ دردِ بلبل چیست　　او ہمیں کار رنگ و بو داند

معشوق معشوقانہ اداؤں کو چھوڑنا چاہتا ہے، اُسکو یوں باز رکھتے ہیں:

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد   مسلمانی میاموز آں دو چشمِ نا مسلماں را

رخصت کے وقت معشوق کو ٹھیراتے ہیں کہ میرے آنسو تھم جائیں تو جانا،

نی روی و گریہ می آید مرا   ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

لطف اور قہر کی نگاہ کی تاثیر کا فرق،

گفتم چگونہ می کُشی و زندہ می کنی   از یک نگاہ کُشت و بنگاہِ دگر زندہ کرد

سعدی کا شعر ہے:-

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم   باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

یہ مضمون اگرچہ نیچرل ہونے کی حیثیت سے اس قدر اعلیٰ درجے کا تھا کہ اسپر ترقی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن امیر صاحب نے ایک اور جدید اسلوب پیدا کیا،

جراحتِ جگرِ خستگاں چہ می پرسی   ز غمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ بدیع اور شوخ کر دیا ہے

نظر لگے نہ کہیں اُنکے دست و بازو کو   یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

معشوق کی آمد کی دلفریبی کو اس طریقے سے ادا کرتے ہیں،

بے وآفتِ تقویٰ و آخر ایں نمیدانی   کہ در شہرِ مسلماناں نباید ایں چنیں آمد

اس مضمون کے ادا کرنے کا معمولی پیرایہ یہ تھا کہ معشوق کے آنے سے لوگوں کے زہد و تقویٰ میں فرق آتا ہے، بجائے اسکے خود معشوق سے خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے شہر میں یوں نہیں آیا کرتے۔ گویا معشوق کا فتنہ انگیز ہونا اس قدر حد سے بڑھ گیا ہے کہ اپنی حالت کا خیال نہیں، بلکہ یہ فکر ہے کہ اسلام کی

حالت خراب نہ ہو جائے۔

معشوق کی زیادتی لطف کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں

جہان ز لطف و شراب ناز او نازد بیش   ز بوئے مست ساقی میدہد پیمانہ را

وحشی یزدی نے اسی خیال سے ایک اور لطیف خیال پیدا کیا

شراب لطف پر در جام میریزی و میترسم   کہ زود آخر شود این بادہ و من در خمار افتم

اکثر جگہ صرف لفظوں کی الٹ پلٹ سے عجیب لطیف بات پیدا کر دیتے ہیں

چشم بد دور از خیال روئے   کہ ازو چشم دور نتوان کرد

مردمان درپی بیہوشی من حیرانند   من در آن کز کہ ترا دید چہ حیران نشود

گفتیم ناخوش است چرا ای خسروا   چون گفتم از آن لب یار نوش است

گفتم کہ ترا ہمیں غلامم   گر ہست گناہ من ہمین است

دہنت ذرہ کم از ذرہ ایست   رخ ز خورشید ذرہ کم نیست

ایہام یعنی ذو معنی الفاظ سے عجیب عجیب نکتے پیدا کرتے ہیں

زبان شوخ من ترکی و من ترکی نمیدانم   چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہان من

پیش ازیں بر خودم یقینے بود   کہ دلم ہیچ دلستان نبرد
ق
تو ببردی ہمہ یقین مرا   بطریقے کہ کس گمان نبرد

دی روئے تو دیدم و مُردم — شرمندہ بماندہ ام ز رویت

دیگر سرآں نیست کہ من زہد فروشم — ساقی قدحے بادہ کہ بریادِ تو نوشم

اکثر جگہ جملۂ معترضہ یا جملۂ شرطیہ سے عجیب عجیب لطیفے پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ انکا خاص مذاق ہے۔

بدوست بادا بوسہ زن پیاں پائے — دگر چیزے نگوید بر دہاں ہم

غمزۂ تو بدعوت سلطاں زند — ورنہ زنجی بدل درویش ہم

زشتم آید کہ بمر پیش تو نام دگراں — وگر انصاف بود پیش تو ہم نتواں گفت

کُشتم از تیغ جفایت خویش را — بر تو آساں کردم و بر خویش ہم

غمے دارم کہ باد از دوستاں دور — بحق دوستی کز دشمناں ہم

مولوی غلام علی آزاد خزانہ عامرہ میں لکھتے ہیں | واقعہ گوئی و معاملہ بندی |

مخفی نماند کہ ہنگامہ آرائے سخن طرازی شیخ سعدی شیرازی کہ مروج طرز غزل است خالی از وقوع گوئی ہم دارد مثل ایں بیت،

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست — تا ندانند رقیباں کہ تو منظورِ منی

اما ناسخ نقوش ماضی امیر خسرو دہلوی کہ معاصر شیخ سعدی است بانی

وقوع گوئی گردید و اساس آں را بلند ساخت"

عشق و ہوسبازی میں جو حالات پیش آتے ہیں، اُنکے ادا کرنے کو وقوع گوئی کہتے ہیں، اہل لکھنؤ نے اسکا نام معاملہ بندی رکھا ہے۔ بہرحال اس طرز ادا کے موجد جیسا کہ آزاد نے لکھا ہے امیر خسرو ہیں۔

شرف قزوینی، ولی دشت بیاضی، اور وحشی یزدی نے اسکو ترقی کی حد تک پہونچا دیا۔ آزاد نے وقوع گوئی کی مثال میں امیر خسرو کے یہ اشعار پیش کیے ہیں۔

خوش آں زماں کہ بروئیش نظر نهفته کنم — چو سوئے من نگرد او، نظر بگردانم

نظاره آں نفسم کام چو خانهٔ او — بخشم گفت کہ از در کشید بیرونش

چو رفتم بردرش بیاید، درباں گفت ایں مسکیں — گرفتار است شاید کیں طرف بسیار می آید

امیر صاحب کے کلام کے زیادہ تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ہر قسم کے نازک، لطیف اور شوخی آمیز معاملات ادا کیے ہیں۔

چند گویند کہ گہ گہ، دلش یاد کند — ایں حدیثے است کہ ہر دل با نیز کند

یعنی لوگ کہتے ہیں کہ خسرو! تم کو وہ کبھی کبھی یاد کرتا ہے۔ لیکن یہ بات تو لوگ تسلی دینے کے لیے بھی کہدیا کرتے ہیں اسلیے کیونکر اعتبار آئے۔

جانا! اگر شبیت دہن بہ دہن نہم — خود را بجواب سازد نگوئیں دہان کیست

معشوق سے کہتے ہیں کہ اگر میں کبھی رات کو تیرے منہ پہ منہ رکھ دوں تو اپنے آپ کو سوتا بنا لینا، یہ نہ کہنا کہ ارے یہ کس کا منہ ہے۔

دل من مست بود قصد دوست — گہے ز انجام وگہ ز آغاز می گفت

اندک اندک گہ گہے با یار بودن خوش بود — ور بسیر گردم بسیار بودن ہم خوش است

تو شبینہ می نمائی بہ برکہ بودی امشب — کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد
مستِ آں ذوقم کہ شب در کوے خویشم دید و گفت — کیست ایں؟ گفتند یکے گدائی میکند
جاں باد فدات آں دم کز بعد دو سہ بوسہ — گویم کہ یکے دیگر، گوئی تو کہ: تو انم
وعدہ می خواہم ورنہ وفا نیز نیم — غرض آنست کہ بارے تقاضا بکنم

روزمرہ اور عام بول چال عموماً شعرا اور اہل فن اپنے کلام کا رتبہ عام بول چال سے برتر سمجھتے ہیں اسکا نتیجہ یہ ہے کہ ایک جداگانہ زبان پیدا ہو گئی ہے جسکا نام علمی زبان ہے۔

سعدی و نظامی وغیرہ کی زبان اگر بولنے کی قلمبند کیجاتی تو بوستان اور سکندر نامہ کی زبان سے صاف الگ نظر آتی۔ بلکہ آج اگر اُس عہد کی بول چال کی کوئی کتاب ہاتھ آ جائے تو ہمکو سمجھنے میں دقت ہوگی۔ لیکن یہ شاعری کا بہت بڑا نقص ہے، بے شبہ شاعری اور عام تصنیف میں ایسے بہت سے مضامین اور خیالات ادا کرنے پڑتے ہیں جو عام زبان میں ادا نہیں ہو سکتے، اسلیے انکے لیے علمی الفاظ وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ ضرورت کے علاوہ اور موقعوں پر بھی یہی مصنوعی زبان استعمال کیجائے خصوصاً غزل کی زبان روزمرہ اور عام بول چال ہونی چاہیے، کیونکہ عاشق و معشوق علمی زبان میں باتیں نہیں کرتے۔

قدما میں فرخی اور متوسطین میں سعدی اور امیر خسرو نے خاص اسکا خیال رکھا کہ روزمرہ اور عام بول چال کو زیادہ وسعت دی جائے۔ سعدی اور خسرو کے کلام میں جو روانی، شستگی اور صفائی پائی جاتی ہے اسکا ایک بڑا گریہ ہے

امیر صاحب کی غزلیں اکثر اُس زبان میں ہوتی ہیں کہ گویا دو آدمی آپس میں بیٹھکر بالکل بے تکلف اور سیدھی سادی باتیں کر رہے ہیں۔ اس میں کہیں کہیں خاص خاص محاورے بھی آجاتے ہیں جو آج ہمکو اسلیے کسی قدر نامانوس معلوم ہوتے ہیں کہ ہمکو اُس زمانہ کے روزمرہ کے محاورات سے واقفیت نہیں۔

دل بسے بردۂ، نکو بشناس — آں کہ مجروح تر از آن من است

یعنی تم نے بہت سے دل لیے ہیں، خوب غور کرکے دیکھو، جو بہت زخمی ہو وہی میرا دل ہے۔

صبح روئے تو بہ نیسان کہ برآمد امروز — نیست امکاں کہ چو من خستہ تا شام کشد[1]

لب و دہان و رخت ہر یکے بلائے دل اند — یکے دلم چہ کند جانب کدام شود

یعنی تیرا لب، دہن اور چہرہ سب بلا ہیں، میرا دل کیا کرے، کدہر کدہر جائے۔

گفتمش اے دل مرو آنجا کہ گرفتار شوی — عاقبت رفت و ہماں گفتۂ من پیش آمد[2]

خلقے براہ منتظر جاں سپردن اند — اے ترک نیم مست عناں را کشیدہ تر
(ذرا باگ کو روکے ہوئے۔)

بوسہ گفت و زباں گرداند — خود ہمی گوید و سخن گرداند

بوسہ دینے کو کہا، اور پلٹ گیا۔ آپ ہی کہتا ہے اور آپ ہی پلٹ جاتا ہے۔

بوے خوشم آید از تو در جیب — گل داری، یا ہمیں است بویت

تیرے بدن سے خوشبو آرہی ہے، تیری جیب میں پھول ہے یا یہ تیری بو ہے۔

خفتنا سالیست در یں عہد و فا رائے اشک — زاں حوالی کہ تو می آئی باداں چوں است

اے گل، دہن تنگت صد تنگ شکر چیزے — گل با تو نمی ماند در حسن گر چیزے

[1] تا شام کشد یعنی شام تک زندہ رہ جائے، [2] یعنی وہی میرا کہا سامنے آیا ۱۲۔

گویم غم و درد م بیں گوئی کہ بتر خواہم — بسم اللہ اگر خواہی زیں ہر دو بتر چیزے
چو سبزہ خویش را خط تو خواند جائے آں باشد — کہ گل از خندہ بر خاک افتد غنچہ شکم گیرد
یعنی سبزہ جب تیرے خط کی برابری کرے تو یہ زیبا ہے کہ پھول ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ جائے اور غنچہ کے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔

دلم میخواستی بر ہم عفاک اللہ چناں بدی — مرا میخواستی رسوا بحمد اللہ کہ آں ہم شد

اے صبا دی کہ فلانے بچمن مے میخورد — ہیچ یادِ من گم گشتہ زندانی کرد

از کجا آمدی اے باد کہ دیوانہ شدم — بوے گل نیست کہ می آیدم ایں بوئے کسی است

دل من دور نہ رفت ست نکو میدانم — باز جوئید ہمیں جاے کہ در کوے کسی است

مشتبہ می شودم قبلہ ز رویت چہ کنم؟ — کہ ز ابروے تو چشمم بدو محراب افتاد
تیرا چہرہ دیکھکر مجکو قبلہ میں دہوکا سا پڑتا ہے — کیونکہ مجکو تیری ابروے دو محرابیں نظر آتی ہیں
رخ جلوہ را نمود و مرا گفت تو ببیں — زیں ذوق مست و بیخبرم کاں سخن چہ بود
سب کو منہ دکھلایا اور مجھ سے کہا کہ تو نہ دیکھ — میں اس مزہ میں مدہوش ہوں کہ یہ کیا بات کہدی
ساکنان سر کوے تو نباشند بہوش — کاں زمینے است کہ آنجا ہمہ مجنوں خیزد

زحشمت کاروان صبر من تاراج کا فر شد — مسلماناں کسے دیدہ است کاندر شہر رہ افتد
مسلمانوں کسی نے شہر میں بھی ڈاکہ پڑتے دیکھا ہے

باز می سوے من آمد بہ شوخی دل زمن بستد — بدو گفتم چہ خواہی کرد گفتا کار می آید

عام محاورہ بکار می آید ہے "کار می آید" امیر صاحب کے سوا اور کسی کے کلام میں نظر سے نہیں گذرا:

حسنِ تو عالمے بخواہد سوخت — ہم در آغاز می تواں دانست

زخ کردی بہ بوسۂ جانے — بندہ بخرید و رائگاں دانست

(تو نے ایک بوسہ کی قیمت جان قرار دی — میں نے خریدا اور یہ سمجھا کہ مفت لیا)

از بہر آں کہ لافِ جمالِ تو میزند — صد بار لالہ بر دہن اسپیں زدہ است

جاں فدائے خنجرِ تسلیم کردہ ایم — خواہی ببخش، خواہ بکش اے رائے تست

ساقی بیار مے کہ چناں سوخت دل زعشق — کز سوزِ ایں کباب ہمہ خانہ بو گرفت

راست کردی ز ابرواں محراب — می نماید نماز خواہی کرد

(ابروؤں سے تو نے محراب درست کی ہے — معلوم ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے کا ارادہ ہے)

من آں ترکِ طناز را می شناسم — من آں مایۂ ناز را می شناسم

شبم تازہ شد جاں بہ دشنامِ مستی — تو بودی من آواز را می شناسم

باد صبا چو از رخِ او زلف در ربود — ابرِ سیہ کشادہ شد و آفتاب کرد

تو حالِ من ہم از زبانِ روز دیدۂ بر — کہ من پیشِ تو پیدا[1] نمی توانم کرد

ساماں نشد کہ بیایم خبر و در کویت — دلِ ویراں شدہ را آمدہ آواز کنم

من از سر زندہ گردم اگر تو یک نفس گوئی — تو میدانم کوئی نیک من گفتار میگویم

[illegible]

---

[1] پیدا کردن: ظاہر کرنا۔

ذعولے خونہاے دل خویش میکنم یک بوسہ برلبم زن و ماالکلام کن

امیر صاحب نے ایسے بھی بہت سے محاورے باندھے ہیں جو اُنکے سوا اور اہلِ زبان کے کلام میں نہیں ملتے۔ مثلاً

از گرہ او چہ میرود،

آواز کردن، پکارنا،

گفتا رسگویم، یوں ہی اک بات کہتا ہوں،

ماالکلام کردن، کسی کو ساکت اور بند کرنا،

اس بات نے بدگمانوں کو موقع دیا ہے کہ یہ ہندوستان کی سکونت کا اثر ہے کہ ہندی محاورے اُنکی زبان سے نکل جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو، لیکن چونکہ ہم کو اپنے تتبع اور استقرا پر اعتماد نہیں، اسلیے ہم اس بدگمانی میں شریک نہیں ہوسکتے۔

تسلسل مضامین

غزل کا یہ بڑا عیب تھا کہ کسی مسلسل خیال کو ادا نہیں کرتے تھے قصائد کا موضوع مدح ہے۔ مثنویاں، قصے یا اخلاق کے لیے مخصوص ہیں، قطعات میں بھی اور اور باتیں ہوتی ہیں۔ عشق اور محبت کے معاملات میں تفصیلی حالات بیان کرنے ہوں، تو کیونکر کریں۔ اسکے لیے صرف مسلسل غزل کام دے سکتی ہے۔ لیکن قدما بلکہ متاخرین میں بھی اسکا رواج بہت کم ہوا۔ امیر صاحب نے البتہ اکثر مسلسل غزلیں لکھی ہیں اور خاص خاص کیفیتوں کا نقشہ اس خوبی سے کھینچا ہے کہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔

مثلاً عاشق، قاصد یا اپنے رازدار سے معشوق کا حال پوچھتا ہے کہ کہاں ہے؟ اور کن لوگوں کے ساتھ ہے؟ کیا کرتا ہے؟ میرا بھی کچھ ذکر کرتا ہے کہ نہیں؟

وغیرہ وغیرہ، دیکھو کس اشتیاق، کس حسرت، کس انداز سے یہ باتیں پوچھتے ہیں،

اے صبا! از من گوی کہ جاناں چون است؟ | آں گل تازہ وآں غنچۂ خنداں چون است؟
بادہ کہ مے میخورد آں ظالم دورے خوردن | آں رخ پر خوے وآں زلف پریشاں چون است؟
چشم بد خوش کہ ہشیار نباشد ست است | چشم سیگونش کہ دیوانہ کند آں چون است؟
روے وزلفِ بتِ عیار کہ آں ہر دو خوش اند | دلِ دیوانۂ من پہلوے ایشاں چون است؟
روز باشد کہ دلم رفت دوراں زلف بماند | یارب آں یوسفِ گم گشتۂ بزنداں چون است؟

پوچھتے پوچھتے دفعۃً خیال آتا ہے کہ معشوق کے ذکر میں اپنا تذکرہ خلافِ عاشقی ہے اسلیے ان سب باتوں کو چھوڑ کر کس محویت سے کہتا ہے،

ہم بجان و سرِجاناں کہ کم وبیش گوے | گو ہمیں یک سخنِ راست کہ جاناں چون است؟

یعنی معشوق کی جان کی قسم ادھر اُدھر کی باتیں نہ کہہ، صرف یہ بتا کہ معشوق کس حالت میں ہے؟

معشوق نے روزہ رکھا ہے، اُسپر عاشق کے دل میں جو جو خیالات پیدا ہوسکتے ہیں اُنکو دیکھو کس طرح ادا کیا ہے،

ماہِ من روزہ میانِ شکرستاں دارد | اے خوش آں روزہ کہ جا در لبِ جاناں دارد
لبِ آلودہ دہاں پُر شکرو نرگس مست | اے مسلمانان! کس روزہ بدینساں دارد
خضر گر بر لبش آید، شکند روزۂ خویش | کاں پسر در تہِ لب چشمۂ حیواں دارد
خونِ من میخورد آخر زنفش پنہاں نیست | من گرفتم کہ خود او روزہ پنہاں دارد
جانِ من گر تو قدم رنجہ کنی، بندۂ تو | قدرے آبِ دو چشم ودلِ بریاں دارد

معشوق سروسامان کے ساتھ سوار آرہا ہے، عاشق پر حیرت طاری ہوتی ہے

کہ کیا آسمان سے چاند اتر آیا ہے؟ یہ خوشبو کیسی پھیل رہی ہے؟ کیا ہوا پھولوں میں بس کر آ رہی ہے؟ - پھر خیال آتا ہے کہ نہیں، معشوق آ رہا ہے، لیکن ان دلفریبیوں کے ہوتے کس کا ایمان سلامت رہے گا، اسلامی آبادی میں یوں نہیں آنا چاہیے - ان خیالات کو سلسل ادا کرتے ہیں،

چہ گرد ماست انیکہ مینجیز دکہ با جاں ہمنشیں آمد | کہ می آید؟ چنیں یارب مگر مہ برزمیں آمد
گدا ایں بادی جنبد کہ بوے یاسمیں آمد | کہ می راند جنیبت را کہ میداں عنبرآگیں شد
کہ در شہرِ مسلماناں نباید ایں چنیں آمد | بتے و آفتِ تقوائے و آخر ایں نمیدانی (سواری)

بہار آئی ہے، عاشق باغ میں جاتا ہے، مجلس آرائی کے سامان ساتھ ہیں، قاصد کو معشوق کے پاس یہ پیغام دیکر بھیجتا ہے کہ باغ میں عجیب بہار ہے، سبزۂ لب جو، اور عالم آب کی سیر قابل دید ہے - قاصد سے یہ بھی کہدیا ہے کہ ادھر ادھر کی باتوں میں آنا چاہیے تو نہ ماننا جس طرح ہو سکے ساتھ لانا، اور اگر عالم مستی میں ہو تو اُسی طرح مست اٹھا لانا - ان تمام خیالات کو تفصیل کے ساتھ ایک غزل میں ادا کیا ہے،

وقتے ہست خوش بہار کہ وقت بہار خوش[1] | آمد بہار و شد چمن و لالہ زار خوش
مستی خوش است و بادہ خوش است و بہار خوش | در باغ با ترانۂ بلبل در یں ہوا
جامے بزیر سایۂ شاخِ چنار خوش | مایم و مطربے و شرابے و محرمے
مارا بکن بہ آمدن آں نگار خوش | اے باد کاہلی مکن و سوے دوست رو
سبزہ خوش است آب خوش و جوبار خوش | چیزے دگر مگوے ہمیں گو کہ در چمن

[1] وقت کسے خوش بودن - دعائیہ جملہ ہے - یعنی خدا انکو خوش و خرم رکھے -

گر خوش کند ترا بہ حدیثے کہ باز گرد — پیشش کُن و بیار و مشو زینہار خوش

در بینیش کہ مست بود ، خفتنش مدہ — ہم ہمچنانش مست بہ نزدِ من آر خوش

من مست خوش حریفیِ او یم کہ آں حریف — سرخوش خوش است مستِ خوش و ہوشیار خوش

با او دراں زماں کہ منش راہ می دہد — بازی خوش است بوسہ خوش است و کنار خوش

(طبیعت)

سروِ پیادہ خوش بود اندر چمن ولیک — آں سروِ من پیادہ خوش است و سوار خوش

بہار میں کیا کیا چاہیے؟ اسکو تفصیل سے لکھتے ہیں،

ہنگامِ گل است بادہ باید — ساقی و حریفِ سادہ باید

گر غنچہ گرہ در ابرو افگند — پیشانیِ گل کشادہ باید

ساقی برخیز و بادہ بستاں — کیں شستہ دہاں ستادہ باید

وانگاہ حریفِ سادہ دست — در چنگِ من اوفتادہ باید

بہار کا سامان

بوستاں جلوہ در گرفت اینک — گُل ز رُخ پردہ در گرفت اینک

آتشِ لالہ بر فروخت ز باد — دامنِ کوہ در گرفت اینک

بلبل آمد نشست بر سرِ گُل — بے نوا بود ، ز سر گرفت اینک

غنچہ در پیش فاختہ ز اصول (موسیقی) — سبقے تازہ بر گرفت اینک

ورقِ غنچہ راکہ تر شدہ بود — درقش یکدگر گرفت اینک

یعنی غنچہ کے ورق چونکہ تر تھے اسلیے چپک کر رہ گئے۔

آب را اگرچہ چشم ہا پاک است — بوستاں را بہ بر گرفت اینک

یعنی پانی گو پاک نظر ہے تاہم اُس نے باغ کو سینہ سے لپٹا لیا۔

خار چوں تیز کرد پیکاں را — گل بصد تو سپر گرفت اینک
طوطی آغاز شعر خسرو کرد — روے گل در شکر گرفت اینک

جدت — جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، امیر صاحب کا دعوے ہے کہ انھوں نے سیکڑوں نئی تشبیہیں ایجاد کیں، اور یہ دعویٰ بڑی دعویٰ ہے، انکی ایک غزل بھی نہیں مل سکتی جس میں کوئی نہ کوئی جدید تشبیہ نہ ہو۔ چند مثالیں ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں،

راز خوں آلودِ خویش اے دل مکن با من بروں — کیں ورق خام ست حرف از وے بروں خواہد گذاشت
اے دل اپنا بھید مجھ سے نہ کہہ، کیونکہ یہ کاغذ کچا ہے اس میں حرف پھوٹ نکلے گا۔
زلفِ او پہلوے خالِ لبِ او — گوئی از شہد مگس می راند

نہ رود مہ بر اوج در شب تار — تا ز زلفِ تو نردبان نبرد
یعنی چاند اندھیری رات میں بلندی پر نہیں چڑھ سکتا، جبتک اسے تیری زلفوں کی سیڑھیاں نہ لگالے،
(چہرہ کو چاند اور زلف کو زینہ سے تشبیہ دی ہے)
مست صحرا چوں کفِ دستِ بردِ از لالہ جام — خوش کفِ دستے کہ چندیں جام صہبا برگرفت
اس مضمون کو دانش مشہدی نے عجیب لطیف پیرایہ میں بدل دیا ہے،
دیدہ ام شاخِ گلے برخویش می پیچم کہ کاش — می توانستم بیک دست اینقدر ساغر گرفت
یعنی پھول کی ایک ٹہنی دیکھی تو جی میں آیا کہ کاش میں ایک ہاتھ میں اتنے پیالے لے سکتا۔

غلامِ نرگسِ مستم کہ بامداد پگاہ　　قدح بدست گرفتہ ز خواب برخیزد

گلستاں نسیمِ سحر یافتہ ست　　صبا غنچہ را خفتہ دریافتہ است

چناں خواب دیدہ ست نرگس بخواب　　کہ گوئی کہ جامِ زر یافتہ است

نرگس کے پھول میں جو زرد کٹوری ہوتی ہے اُسکو جامِ زر سے تشبیہ دیتے ہیں، اور یہ تشبیہ عام تھی، لیکن اس اسلوبِ بیان نے کہ نرگس نے خواب میں دیکھا کہ اُسکو جامِ زر ہاتھ آگیا ہے، ایک خاص لطف پیدا کر دیا۔ اور چونکہ نرگس کو مخمور اور خواب آلود باندھتے ہیں اس لیے خواب دیکھنے کی توجیہ واقعیت کا پہلو رکھتی ہے۔

میروی و گریہ مے آید مرا　　ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

آنسو کی جھڑی کو سب بارش سے تشبیہ دیتے آئے ہیں، لیکن یہ بالکل نیا اسلوب ہے کہ معشوق سے کہتے ہیں کہ تیرے جانے کے وقت مجھکو رونا آتا ہے، اتنا ٹھیر جا کہ بارش تھم جائے۔

مزید لطف یہ ہے کہ معشوق کا جانا ہی اس بارش کی علت ہے اسلیے وہ جانا چاہے گا تو بارش ہوگی، اور اسلیے وہ کبھی نہ جا سکے گا۔

مے میانِ شیشۂ ساقی نگر　　آتشے گویا بہ آب آلودہ اند

ابر آمد و بہ ساغرِ لالہ شراب کرد　　در گوشہ ہاے باغ بسے ذرِ ناب کرد

فراشِ باغ بارِ گہ خود بپا نزد　　وانگہ بر آب، خرگہِ سیم از حباب کرد

نرگس کہ شب نخفت ز فریاد بلبلاں | نہاد سر بہ بالش گل ہیں خواب کرد

مضمون آفرینی

خیال بندی اور مضمون آفرینی کا موجد کمال اسمٰعیل خیال کیا جاتا ہے لیکن کمال کی جدت قصائد کے ساتھ مخصوص ہے، غزل میں اس نے اس رنگ کی مطلق آمیزش نہیں کی ہے۔ غزل میں نئے نئے مضامین اور نئے نئے اسلوب پیدا کرنے امیر صاحب کی ایجاد ہے اور انھیں پر خاتمہ بھی ہوگیا۔ متاخرین کی مضمون آفرینیاں گو حد سے بڑھ گئیں، لیکن اسکا دوسرا انداز ہے، وہ اور سلسلہ کی چیز ہے، چنانچہ آگے چل کر اسکی حقیقت کھلے گی۔

امیر صاحب کی مضمون آفرینیاں مختلف قسم کی ہیں۔ مثالوں سے اندازہ ہوگا۔

بخانۂ تو ہمہ روز بامداد بود	کہ آفتاب نیارد شدن بلند انجا
تیرے گھر میں ہمیشہ صبح رہتی ہے	کیونکہ وہاں آفتاب اونچا نہیں ہوسکتا
زلفِ تو سیہ چہ است؟ بانا نابا	لب بام در آفتاب گشتہ است پھرا

مشتبہ می شودم قبلہ ز رویت چہ کنم	کہ ز ابروے تو چشم بدو محراب افتاد
چشم مست تو کہ دی بر من بیتاب افتاد	تو نیفگندی از آن اودگی خواب افتاد

ز ہجراں چنیں تار ایک باشد خانۂ چشم | کہ ہرگز آفتاب من درین روزن نمی آید

پیش تو آفتاب نتواں جست | روز روشن چراغ نتواں کرد[1]

---

[1] چراغ کردن ۔ چراغ جلانا ۱۲

می روی و گریہ می آید مرا　　ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

دلِ من بہ زلف و رویت شد اسیر و چوں نگردد　　شبِ ماہتاب دزدے کہ بخانہ در آید

زہے عمر دراز عاشقاں کہ　　شبِ ہجراں حسابِ عمر گیرند
یعنی اگر شبِ ہجر کو بھی شامل کر لیا جائے تو عاشقوں کی عمر کس قدر بڑی ہوتی ہے،
زلف ازاں می بُرد آں شوخ کہ شبہائے غم　　گر شود کوتہ ازاں جا ہمہ پیوند کند
یعنی اپنی زلف وہ اسلیے تراشتا ہے کہ میرے غم کی راتیں چھوٹی ہو جائیں تو اُن میں جوڑ لگا کر بڑھا دے۔

راہے است برائے بردنِ دل　　ابروے تو کز میاں کشادست
یعنی تیری دونوں ابروؤں کے درمیان جو فاصلہ ہے، اسلیے ہے کہ دل لیجانے کیلیے راستہ رہے
زلفت سرو پا شکستہ زاں است　　کز سرو لبت او فتاد است

یک شب ز رخِ خویش چراغیم کرم کن　　تا قصہ اندوہِ تو ہم پیشِ تو خوانم
(یعنی کسی رات کو اپنے چہرہ کا چراغ عنایت کرو کہ میں اسکی روشنی میں اپنا قصہ تمہارے سامنے پڑھ کر سناؤں)

خانۂ چشمِ من خراب شد است　　کہ بہ بنیادِ تو خانہ رفتہ است

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی　　مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

تنگیِ لعلِ تو کانِ نمک ہست　　　　گرچہ تنگر: بکانِ نمک است

آبِ روے تو ملاحت افزود　　　　گرچہ از آب زیان نمک است

خواہی لے جان برو خواہ بمن باش کہ من　　　　مُردنی نیستم امروز کہ جاناں اینجاست

آئینہ کرد حسن وے از آسماں سوال　　　　برخاست آفتاب بہ زانو جواب کرد

(یعنی اسکے حسن نے آسمان سے آئینہ مانگا۔ آفتاب نے ادب سے زانو ٹیک کر کہا کہ حاضر ہے)

ہر ابروے تو گردم گرہش باز کشاے　　　　کہ کمانست: باندازہ بازوے کسی است

ہر چند کہ زلف تو سیاہی است جہانگیر　　　　زنگو: پریشاں نتواں کرد سیہ را

بہ سایہ خفتہ بُدم من کہ یار آمد و گفت　　　　چہ خفتہ کہ رسید آفتاب در سایہ

اکثر شاعرانہ اجتماع النقیضین ثابت کرتے ہیں اور وہ طبیعت پر استعجاب کا اثر پیدا کرتا ہے۔

ع۔ دو یا دادی و درمانی ہنوز۔

ع۔ یاد باد آنکہ ہمہ عمر نہ کردی یادم۔

صنائع　امیر صاحب نے اعجاز خسروی میں صنائع و بدائع پر اس قدر ہمت صرف کی کہ ہمکو بڑا ڈر تھا کہ جو جال اُنھوں نے بچھایا اُس میں خود نہ پھنس جائیں۔ لیکن یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ جن جن لوگوں نے صنائع و بدائع کو فن بنایا اور اسپر مستقل

کتابیں لکھیں، مثلاً قرنی و ابن المعتز وغیرہ، وہ خود اس بدعت سے محفوظ رہے۔
امیر صاحب اوروں کی بہ نسبت کسی قدر آلودہ ہیں، تاہم انکے صنائع بہت سے
بے تکلف بھی ہوتے ہیں اور اس حد تک نہیں پہونچتے کہ نکتہ گیری کی زد میں آجائیں
صنعت طباق یعنی اضداد انکی خاص مرغوب چیز ہے اور وہ اسکو بڑی خوبی سے
نباہتے ہیں۔ ع درد ہا دادی و درمانی ہنوز،

زبند دو جہاں آزاد گردم — اگر تو ہمنشین بندہ باشی
تنِ درویش را گشتی بغمزہ — کرم کردی الٰہی زندہ باشی

گفتیم ناخوش چرا ای خسروا — چون کنم ہاں شکل و آں بالا خوش است

بندہ را در غم تو نیست خبر — ہمہ یاران بندہ را خبر است

خُرد سالے بہ کند بیداد — اے بزرگانِ شہر داد دہید

عربیت اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امیر صاحب کو عربی علم ادب میں کمال
تھا اور اس فن کی نادر کتابیں انکے حافظہ میں مخزون تھیں۔ تاہم انکو اس فن میں دعوے
نہیں۔ عزۃ الکمال کے دیباچہ میں عربی کے چند اشعار لکھے ہیں جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود
تھا کہ باوجود اعتراف عجز کے انکو اس زبان پر کس قدر قدرت ہے۔ اشعار یہ ہیں:۔

ذاب الفواد و سال من عینی الدم — وحلیٰ لدی و اسمع کلما انا اکتم
دل پگھل گیا، اور آنکھوں سے خون بہا — اور آنسوؤں نے وہ سب کہدیا جو میں چھپاتا تھا

وإذا ابحت للإلورى كرب النوى ۔۔۔ تبكي الاحبة والاعادي ترحم

اور جب میں لوگوں کے سامنے فراق کی تکلیف بیان کرتا ہوں تو دوست روتے ہیں اور دشمنوں کو رحم آتا ہے

یا عاذل العشاق دعنی باکیا ۔۔۔ ان السکون علی المحب محرم

او ناصح! تو مجھے رونے دے، چپ رہنا عاشق پر حرام ہے۔

من بات مثلی فھو یدری خلیلتی ۔۔۔ طول اللیالی کیف بات متیم

جو شخص میری طرح رات گذارے وہ البتہ سمجھ سکتا ہے کہ عاشقوں کی رات کس طرح گذرتی ہے

اعجاز خسروی میں، عربی زبان میں خطوط لکھے ہیں، جن سے اُنکی عربیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ان میں قافیہ بندی اور لغو تکلفات ہیں، لیکن یہ اُس زمانہ کا عام انداز تھا، تنہا ان پر الزام نہیں آ سکتا۔

وان انا الا من غزیة ان غوت ۔۔۔ غویت وان ترشد غزیة ارشد

میں بہر حال قبیلہ غزیہ کا آدمی ہوں، غزیہ گمراہ ہے تو میں بھی گمراہ ہوں اور وہ ٹھیک راستہ پر ہو تو میں بھی ہوں۔

صنایع وبدایع امیر صاحب نے صنائع وبدائع میں جو زور آوریاں صرف کیں، اگرچہ کوہ کندن وکاہ برآوردن ہیں، لیکن اس لحاظ سے کہ انکی محنت بالکل رائیگاں نہ جانے پائے، اُنکا اجمالی تذکرہ کرنا ضرور ہے۔

ان میں بہت سی صنعتیں وہ ہیں جو عربی میں موجود تھیں، لیکن فارسی میں انکا ادا کرنا اسلیے مشکل تھا کہ فارسی زبان کی کم وسعتی اسکی متحمل نہیں ہو سکتی، مثلاً صنعتِ منقوطہ یعنی عبارت میں ایسے الفاظ لانا جن کا ایک ایک حرف نقطہ دار ہو، امیر صاحب نے اس قسم کی صنائع میں صفحے کے صفحے لکھے ہیں بعض فارسی میں تھیں، لیکن ایک آدھ سطر سے زیادہ کوئی شخص نہ لکھ سکا، امیر صاحب

نے ورق کے ورق لکھے۔ بعض صنائع میں اُنھوں نے تصرفات کیے، اور بعض بالکل خاص انکی ایجاد ہیں، چنانچہ ہم اُنہی کو مختصر طور پر لکھتے ہیں۔

دو رُو، یعنی ایسی عبارت لکھنی کہ نقطوں کے رد و بدل سے دو مختلف زبانوں میں پڑھی جاسکے اور بامعنی ہو۔ امیر صاحب نے اس صنعت میں کئی صفحے لکھے ہیں، لیکن کاتبوں کی غلط نویسی سے انکا صحیح پڑھنا ناممکن ہے اسلیے صرف ایک آدھ سطر پر اکتفا کرتا ہوں۔

رسیدی۔ بدیدی مرادی بجانے زمانے بباشی، بیاری بتائی

اس شعر کو اگر فارسی میں پڑھیں تو اسکا لفظی ترجمہ یہ ہے "کل تو آیا اور تو نے مجکو ایک مکان میں دیکھا، ایک ذرا ٹھیرجا، تو دوستی کرنے کے قابل ہے"۔ لیکن اگر اسی کو عربی میں پڑھیں تو یوں پڑھ سکتے ہیں،

رشیدی، ندیدی، مرادی نجاتی زمانی بیأسِ تبادی نسائی

"تو میرا ہدایت یافتہ ہے، بے نظیر ہے، میری مراد ہے، میری نجات ہے، مجکو اس بات نے نا امید کیا کہ عورتیں باہم لڑتی ہیں"

قلب اللسانین، بہت اشعار لکھے ہیں کہ فارسی میں ہیں لیکن اگر اُن کو اُلٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بنجائے۔ مثلاً

بسی با کامرانی درجہاں باش۔
می باش بکار شادمانی،
باہی یار ما کہ کار می کنیم ہم،
دوست ما یار ہنی بہ یاری ما آئی،

بکن داد و بکشور کامراں باش،

ان تمام مصرعوں کو اُلٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بنجاتی ہے۔

وصل الحرفین ۔ یہ وہ صنعت ہے کہ جس قدر الفاظ عبارت میں آئیں ان میں کہیں کوئی حرف الگ نہ آئے، بلکہ دو دو، یا تین تین حرف کا لفظ ہو، مثلاً

چاکر خاصہ، حاجی شرقانی، سر خدمت، بر پایت می مالد، و می گوید،

کہ بدیں جانب خاطر ما با فرحت قریں می باشد باید کہ گہ گہ جانب ما نامہ

فرماید، تا ہر خوشی کہ بر ماست فرخی کامل یابد۔

یہ اُس صنعت کا نقیض ہے، جسکا ہر لفظ الگ الگ حرفوں میں لکھا جاتا ہے مثلاً

بر، دور، وداد، آورد، روداد، دارای، داری، دوار، ذات

داور، دوراں را، الخ۔

امیر صاحب نے اس صنعت پر کئی صفحے کی عبارت لکھی ہے۔

ابیۃ الحروف ، اس صنعت پر امیر صاحب کو بہت ناز ہے۔ کئی کئی سطروں کی بامعنی عبارت لکھی ہے، اور یہ التزام کیا ہے کہ صرف چار حرف یعنی الف، ہ، واؤ، یے، کے سوا اور کوئی حرف نہ آنے پائے، یعنی تمام الفاظ صرف انہی حرفوں سے بنے ہیں، لیکن جو عبارت لکھی ہے، وہ بالکل مہمل معلوم ہوتی ہے اور اسکا پڑھنا سخت مشکل ہے۔

معجزۃ الالسنۃ والشفا ، اس صنعت پر بھی انکو ناز ہے، اس میں ایسے الفاظ جمع کیے ہیں کہ سطروں کی سطریں پڑھتے جاؤ، لیکن کہیں ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوگی، صرف حلق سے تمام الفاظ نکلیں گے۔

ترجمۃ اللفظ، یہ صنعت بھی خاص انکی ایجاد ہے، اس میں یہ التزام ہے کہ جو لفظ آتا ہے، اُسکے بعد کا لفظ، دوسری زبان کے لحاظ سے پہلی لفظ کا ترجمہ ہو جاتا ہے
مثلاً سودای رخ تو کُشت مارا،
یہ فارسی مصرع ہے۔ لیکن کشت کا اگر اُردو میں ترجمہ کریں، تو "مارا" ہوگا اسلیے مصرع کا اخیر لفظ پہلے لفظ کا ترجمہ بھی ہے۔ امیر صاحب نے اس صنعت میں پورے صفحہ بھر کی عبارت لکھی ہے۔

محتمل المعانی، ایک شعر میں ایک لفظ لائے ہیں کہ اُسکے سات معنی ہیں اور ہر معنی وہاں مراد لیے جا سکتے ہیں۔

موقوف الآخر، ایک رباعی لکھی ہے، جس کا ہر قافیہ، دوسرے مصرعہ کے آغاز کا محتاج رہتا ہے۔ مثلاً

در حُسن ترا، کسے نماند اِلّا	خورشید کہ ہر صبح بروں آید، تا
خدمت کند و پاے تو بوسد، امّا	بینی تو بسوی او، چو پا بوسد، تا

انہی صنعتوں اور بیجا کاوشوں میں کئی جلدیں لکھڈالی ہیں۔ اگر کسی صاحب کو امیر صاحب سے زیادہ مغز کاوی مقصود ہو تو اعجاز خسروی موجود ہے مطالعہ فرمائیں ؛

مطبوعات الناظر پریس لکھنؤ

قواعد اُردو - اردو زبان کی سب سے پہلی جامع مبسوط اور با اصول قواعد- از مولوی عبدالحق بی اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو- قیمت عہ

محاربات صلیبی - صلیبی لڑائیوں کے حقیقی حالات جو اُنکی ایک مسیحی جماعت نے شایع کیے اور باوجود مذہبی تعصب کے مسلمانوں کی اولو العزمیوں کا اعتراف کیا ہے- قیمت ۱۲ر

الاحسان - تصوف کی تاریخ اور اسکی درجہ بدرجہ ترقی کے حالات- قیمت ۸ر

میلاد ابن جوزی - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت با سعادت کے متعلق بہترین کتاب ہے جس میں کمال انشا پردازی کے ساتھ تمام واقعات صحیحہ بیان ہوئے ہیں- اصل عربی کے ساتھ اُردو ترجمہ بھی قابل دید ہے- قیمت ۴ر

واقعاتِ کربلا - میر انیس کے ایک ہی بحر کے مرثیوں کا انتخاب ایسے تسلسل کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے کہ ابتدا سے انتہا تک کل مناظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں- قیمت ۱۲ر

تسخیر فرانس - شیکسپیر کے مشہور ڈرامے ہنری دی ففتھ کا اردو ترجمہ- اُردو انشا پردازی کا بہترین نمونہ- قیمت ۸ر

حیات نظامی - مولانا نظامی گنجوی مصنف سکندر نامہ کے حالات زندگی قیمت ۴ر

کلیات نعت - فدائے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت محسن کاکوروی کا مقبول عام کلام- قیمت عہ ۱۲ر

تذکرۂ حزیں - شیخ علی حزیں مشہور فارسی شاعر کی سوانح عمری- قیمت ۴ر

ترقی زبان بذریعہ تراجم - پروفیسر گوشال ایم اے کا وہ قابل قدر لکچر جو صاحب موصوف نے اردو کانفرنس منعقدۂ لکھنؤ میں پڑھا تھا قیمت ۴ر

زود پشیمان - اُردو میں اپنے طرز و انداز کا سب سے پہلا اور دلچسپ ڈراما- اسکی ابتدا میں مسلمانوں مرزا رسوا، مولوی سید سلیمان ندوی اور مسٹر سجاد حیدر بلدرم کی تقریظات پڑھنے کے قابل ہیں- قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی- لکھنؤ